رحمٰن کے سائے میں



حافظ محمد ادریس

رحمٰن کے سائے میں

حافظ محمد ادریس

البدر پبلی کیشنز
۲۳- راحت مارکیٹ ● اُردو بازار ● لاہور-۲

عرضِ ناشر

قرآنی دُعائیں خیر و برکت کا باعث ہیں۔ کٹھن سے کٹھن حالات اور مشکل سے مشکل وقت میں یہ دُعائیں طمانیتِ قلب کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ دُعائیں پڑھتے ہُوئے اِنسان اللہ العالمین کے سامنے جب عجز و انکساری کا پیکر بنتا ہے تو پھر خُدا کی رحمتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ خُدا کے حضُور جب انسان اس یقین کے ساتھ ہاتھ پھیلاتا ہے کہ واحد اللہ ہی کی ذات ہے جو خبیر و علیم بھی ہے، رازق بھی ہے اور غفُور و رحیم بھی ہے تو اسے یُوں اطمینان محسوس ہوتا ہے جیسے بچّہ ماں کی گود میں پہنچ کر سکون محسوس کرتا ہے۔

"رحمٰن کے سائے میں" قرآنی دُعاؤں کا مجمُوعہ آپ کی خِدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ آپ یقیناً اس کو پہلے مجموعوں سے مُنفرد اور بہتر پائیں گے۔

خدُا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور اپنے بھائیوں کی دعاؤں سے ہم اس مجمُوعہ کو اپنی روایات کے مُطابق بہتر معیار پر طبع کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین پہلے کی طرح ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

دعاؤں کا طالب

عبدالحفیظ احمد

طابع ——— عبدالحفیظ احمد

ناشر ——— البدر پبلیکیشنز

اشاعت اول ——— مارچ ۱۹۷۷ء

تعداد ——— گیارہ سو

اشاعت دوم ——— مئی ۱۹۸۷ء

تعداد ——— ایکہزار

قیمت ——— ۲۱/۰۰ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

میرے نہایت عزیز دوست اور بھائی حافظ محمد ادریس اپنے سینے میں اسلام کا درد رکھنے والے ذی علم مسلمان ہیں۔ اللہ نے انھیں زبان و قلم دونوں سے نوازا ہے۔ اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے انہوں نے اپنی صلاحیتیں غلبۂ اسلام کے عظیم مشن کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ اب تک اُن کی کئی تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ "رحمان کے سائے میں" ان کی تازہ تالیف ہے۔ یہ دراصل قرآنی دعاؤں کا مجموعہ ہے، لیکن اب تک قرآنی دعاؤں کے جتنے مجموعے شائع ہوئے، اشاید اس کا انداز اُن سب سے جدا ہے۔ یہ مجموعہ ایک نرالی انفرادیت کا حامل ہے۔ اس میں ہر قرآنی دعا کے ساتھ ساتھ اس کا مکمل تاریخی پس منظر بھی دیا گیا ہے۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر کسی دعا کو پڑھنے والا محسوس کرتا ہے گویا وہ خود اُس ماحول میں موجود ہے اور اُن حالات سے گزر رہا ہے، جن میں ابتداً وہ دعا مانگی گئی تھی۔ یقیناً اس طور پر کسی دعا کو پڑھنا، پڑھنے والے کے لیے ایک انوکھا اور خوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ قاری کو ہر دعا کے ساتھ ساتھ علم ہوتا جاتا ہے کہ کس دَور میں، اللہ کے کن بندوں نے، جد وجہد اور آزمائشوں کی کن کن دشوار گزار گھاٹیوں میں یہ دعا مانگی تھی۔ اس طرح یہ تالیف نہ صرف خدا سے تعلق کی مضبوطی اور علم میں اضافہ کا ذریعہ بنتی ہے بلکہ اللہ کے اُن محبوب بندوں کے نقوشِ قدم پر چلنے کی تڑپ بھی پیدا کرتی ہے جنھوں نے قیامِ حق کی جد وجہد کرتے ہوئے دعاؤں کا یہ اُسوہ ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

اس مجموعے کی تالیف میں قرآن کی بہترین جدید و قدیم تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن کے علاوہ، سید قطب شہیدؒ کی

"فی ظلال القرآن"، مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تفسیر ماجدی"، مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر "تدبر قرآن" اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا حاشیۂ قرآن بھی مؤلف کے پیش نظر رہے ہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح یہ تالیف کتنی قیمتی معلومات کا مرقع بن گئی ہے۔

اُمید ہے کہ ان خصوصیات کی بناء پر یہ کتاب قبول عام حاصل کرے گی اور پڑھنے والے اسے نہایت مفید پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ فاضل مؤلف کی اس کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے اور انھیں اپنے قلم اور اپنی زبان سے اسلام کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

—— منوّر حسن

ادارہ "معارف اسلامی"

کراچی

انتساب

اپنے والدین کے نام

جنھوں نے بچپن سے
ہی میرے دل و دماغ
میں یہ حقیقت راسخ کر
دی کہ انسان کی جبینِ نیاز
صرف ایک اللہ کے سامنے
جھکنی چاہیئے۔

مقدّمہ

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین وعلی آلہٖ واصحابہٖ اجمعین ومَنْ تبعھُم باحسان اِلیٰ یوم الدین

یہ کتاب قرآنی دعاؤں پر مشتمل ہے اور اس کا نام "رحمان کے سائے میں" تجویز کیا گیا ہے۔ دراصل اس کتاب کا آغاز بھی میری کتاب "روشنی کے مینار" کی طرح لیکچرز سے ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جنوری ۱۹۷۲ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد میں نے اپنے گاؤں کی جامع مسجد میں نمازِ فجر کے بعد سقوطِ مشرقی پاکستان کے تاریخی، سیاسی اور نظریاتی اسباب پر ایک مسلسل سلسلۂ خطاب شروع کیا۔ چند ہی لیکچر ہوئے تھے کہ البدر کے تذکرہ میں اصحاب کہف کا ذکر آ گیا۔ دین و ایمان کی حفاظت کا جذبہ، قربانی و ایثار اور عزم، غرضیکہ بہت سے امور میں اصحاب کہف اور مجاہدین البدر میں مجھے مماثلت نظر آئی۔ میں نے ہر دو کا موازنہ کیا اور اصحابِ کہف کی وہ دعا جو انہوں نے اپنی نماز میں مانگی تھی، مشرقی پاکستان کے جری اور عالی ہمت نوجوانوں کی کارکردگی کی روشنی میں بیان کی۔ ان نوجوانوں کا بھی نعرہ اصحاب کہف کی طرح یہ تھا کہ ہم اللہ کے نام پر حاصل شدہ سرزمین کو لادینی طاقتوں کے حوالے نہیں ہونے دیں گے۔ چٹا گانگ اور سلہٹ کی پہاڑیوں میں کتنے ہی سر بکف مجاہد جذبۂ شہادت سے سرشار ہتھیار ڈالنے کے تصوّر سے ارفع و اعلیٰ مصروفِ جہاد تھے[1]

---

[1] آج ۲۲ اپریل ۱۹۷۴ء کو جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، کچھ معلوم نہیں میرے ان نوجوان بھائیوں کا کیا حال ہے۔ حکومتِ پاکستان نہ صرف بنگلہ دیش کو تسلیم کر چکی ہے بلکہ برسرِ عام اپنے سپاہیوں کی "بنگلہ دیش" میں "زیادتیوں" پر ان کی مذمت کر چکی ہے اور بنگلہ دیش سے معافی مانگ چکی ہے۔

عقل بسوخت زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

اس دن کے خطاب کے بعد سامعین نے تجویز پیش کی کہ آئندہ مشرقی پاکستان کے واقعات اور البدر کی جدوجہد کا تذکرہ قرآنی دعاؤں کی روشنی میں کیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز کا لیکچر دربارِ فرعونی میں حاضری دینے والے جادوگروں کی دعا پر مشتمل تھا۔ وہ جادوگر کہ جن کے سامنے حق اور باطل واضح ہوگیا تھا اور جنھوں نے پھانسی کی سزا نہایت خندہ پیشانی سے سُنی اور تختۂ دار کو چوم لیا۔ تختہ دار کی طرف جاتے ہوئے وہ اللہ تعالیٰ سے صبر کی توفیق اور خاتمہ بالخیر کی دعا مانگ رہے تھے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ کچھ روز تک جاری رہا اور بعض قرانی دعائیں موضوعِ سخن بنیں۔

تھوڑے عرصہ کے بعد میں لاہور چلا گیا۔ ذہن میں یہ خیال تھا کہ قرآن مجید کی ان دعاؤں کو مرتب کیا جائے۔ مولانا خان محمد ربانی کی مرتب کردہ قرانی دعاؤں کے علاوہ کچھ اور چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی نظر سے گزریں مگران کے انداز سے میرے ذہن کا نقشہ مختلف تھا میں چاہتا تھا کہ تمام قرآنی دعاؤں کو ان کی شانِ نزول اور تاریخی پس منظر کے ساتھ بیان کروں۔ نیز اس کے ساتھ ہی ہر دعا کا ہم مسلمانوں کے لیے آج جو پیغام ہے اس پر بھی کچھ عرض کردوں میں نے بعض احباب سے اس کا تذکرہ کیا اور سارا ذہنی خاکہ ان کے سامنے بیان کیا تو انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے اس پر کام ہونا چاہیئے۔ بزرگوں کے ساتھ بھی اس مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ مولانا خلیل حامدی صاحب، مولانا محمد سلطان صاحب، ملک غلام علی صاحب اور استاذ الاساتذہ مولانا محمد چراغ صاحب سے خصوصی رہنمائی کے لیے یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ تمام بزرگوں نے فرمایا کہ اس طرز پر اردو میں کم از کم ہماری نظر سے ایسی کوئی کتاب نہیں گزری اور اگر اس نہج پر کام کیا جائے تو مستحسن ہے۔ ان بزرگوں کے ان خیالات سے کافی حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے ارادۂ مصمم کرلیا کہ اپنی استطاعت کے مطابق اس موضوع پر کام کروں گا۔

دسمبر ۷۳ء میں اللہ کا نام لے کر کام شروع کردیا۔ اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں میں نے تفسیر ابن کثیر اور سید مودودی کی تفہیم القرآن سے بہت مدد لی ہے۔ ان کے علاوہ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کا حاشیۂ قرآن، سید قطب شہیدؒ کی فی ظلال القرآن اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی تفسیرِ ماجدی اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تدبرِ قرآن (جلد سوم) زیرِ مطالعہ

رہی ہیں۔ میں نے جہاں جہاں سے بھی خوشہ چینی کی ہے اس کا حوالہ دے دیا ہے۔

میرا طریق کار اس کتاب کی تالیف میں یہ رہا ہے کہ نمازِ عشاء کے بعد مطالعے کے لیے بیٹھ جایا کرتا تھا اور دو تین گھنٹے مسلسل مطالعہ کرتا رہتا۔ لکھنے کے لیے صبح کا وقت مقرر تھا۔ صبح نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد لکھنے کے لیے بیٹھتا اور ناشتہ کے وقت تک تقریباً ایک گھنٹہ روزانہ لکھتا۔ درمیان میں کبھی کبھار ناغے بھی ہو جایا کرتے۔ ملکۂ سبا کی دعا (سورۂ نمل) لکھ چکا تھا کہ جدہ سے برادرِ محترم راؤ محمد اختر صاحب کا تار ملا کہ جلد از جلد جدہ پہنچوں۔ یہ جنوری کے وسط کی بات ہے۔ سفر کی تیاری کے لیے بھاگ دوڑ ایسی پڑی کہ تحریر کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

۳۱ جنوری کو میں لاہور سے جدہ پہنچ گیا۔ جدہ سے کچھ عرصہ کے لیے غائب رہا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کرنا تھی۔ ۸ فروری کو جدہ میں دوبارہ لکھنے کے لیے بیٹھا اور اپنی نیروبی روانگی یعنی ۱۵ فروری تک ایک ہفتے میں تمام باقی ماندہ دعائیں مرتب کر لیں۔ جدہ سے ارادہ تھا کہ نیروبی پہنچ کر مسودے پر نظرِ ثانی کر کے اس مختصر سی کتاب کو مکمل کر لوں گا مگر یہاں آکر ایسی مصروفیت رہی کہ اس طرف بالکل توجہ نہ دے سکا۔ اب کچھ وقت نکال کر مسودے پر نظرِ ثانی کی ہے اور دعاؤں کے آغاز میں فلسفہ و حکمتِ دعا کے عنوان سے ایک مضمون کا اضافہ کیا ہے۔

کتاب کا نام تجویز کرنا ایک کارِ مشکل تھا۔ شروع سے ہی میں خود بھی اس پر سوچتا رہا اور دوستوں کو بھی دعوتِ فکر دیتا رہا مگر کوئی موزوں نام ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ مصنفین حضرات کو یہ معلوم ہو گا تو یقیناً وہ اس مضحکہ خیز کیفیت پر ہنس دیں گے کیونکہ لوگ پہلے کتاب کا نام رکھتے ہیں پھر طبع آزمائی کرتے ہیں مگر یہاں معاملہ برعکس ہے۔ قرآنی دعاؤں کے نام سے تو کئی کتابچے پہلے سے ہی موجود تھے۔ ادعیہ مسنونہ کے سلسلے میں علامہ ابن الجوزی نے اپنی دعاؤں پر مشتمل کتاب کا نام " الحصن الحصین " اور حافظ ابن القیم نے اپنی شہرہ آفاق کتاب کا نام " الوابل الصیب من الکلم الطیب " رکھا تھا، جبکہ سید حسن البناء شہیدؒ نے اپنی مختصر سی کتاب کو " الماثورات " کے نام سے لکھا۔ میں اپنی اس کتاب کا نام " رحمان کی پناہ میں " رکھتا ہوں۔

تالیفِ کتاب کے سلسلہ میں میری کوشش رہی ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق قرآن و سنت

کی روشنی میں دعاؤں کی تشریح کردں۔ اگر کسی موقع پر مجھ سے کوئی خطا یا غلطی ہو گئی ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے۔ اہلِ علم کے سامنے ایک کم مایہ و ہیچمدان طالب علم کی یہ کاوش پیش خدمت ہے۔ ان سے مؤدبانہ التماس ہے کہ اس میں پائی جانے والی فروگزاشتوں پر راقم کو متنبہ فرمائیں کیونکہ "الدین النصیحۃ" کا یہ بنیادی تقاضا ہے۔

اے مالکِ کل اس کتاب کی تالیف اگر تیرے نزدیک مستحسن اور موجب ثواب ہے تو تُو یہ ثواب مشرقی پاکستان کے شہدائے البدر کی روحوں کو پہنچا دے اور ان کے درجات میں بلندی فرما۔

اللھم صل علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً

والسلام

حافظ محمد ادریس

۲۸ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۷۴ء

(اسلامک فاؤنڈیشن ص-ب ۳۰۶۱۱ - نیروبی - کینیا)

فلسفہ و حکمتِ دعا

دعا عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ دعی ہے۔ دَعیٰ ۔ یَدْعُوْ کا مطلب ہے آواز دینا۔ بلانا۔ پکارنا۔ دعوت دینا۔ دعا کے ان لغوی معانی کے ساتھ اس کا اصطلاحی مفہوم زیادہ وسیع ہے۔ اصطلاحی معانی میں دعا سے مراد ہے کسی کو مدد کے لیے پکارنا، کسی سے اپنی حاجات طلب کرنا، کسی سے دادرسی چاہنا وغیرہ وغیرہ۔

دعا کو عربی میں دعوۃ بھی کہا جاتا ہے۔ سورۃ الرعد میں فرمایا " لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ " (اسی کو پکارنا برحق ہے) انسان نہایت کمزور مخلوق ہے۔ اس کی بے شمار ضروریات ہوتی ہیں جن کے لیے اسے کسی بالاتر قوت کو پکارنا پڑتا ہے۔ نفسیاتی طور پر وہ جہاں اپنے آپ کو لاچار و بے بس محسوس کرتا ہے وہیں اس کے دل سے آواز اٹھتی ہے کہ " اس قوتِ علیا " کو اپنا حال سنائے اور اس سے اعانت طلب کرے۔

یہ " بالاتر ہستی " یا " قوتِ علیا " کیا ہے؟ اس کے پہچاننے میں انسان نے بار بار دھوکہ کھایا ہے۔ کبھی اس نے مظاہرِ قدرت کو، جو خود بھی کسی منتظم اور صانع کے لگے بندھے اصول پر کاربند ہیں اور اس کے حکم سے ذرہ برابر سرتابی کی مجال کے اندر نہیں ہے۔ اپنی مدد کے لیے پکارا۔ کبھی اس نے درختوں کے اندر یہ مافوق الطبیعاتی قوت " تلاش " کر لی اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے چلہ کشیاں کرتا رہا۔ کبھی اس نے ان جانوروں کو اپنا دیوتا بنا کر ان کی پرستش کی اور دعائیں مانگیں جو بے چارے خود اس کی غلامی کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ کبھی اس نے فرشتوں اور جنوں کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا اور ان کو پکارتا رہا۔ کبھی " ارواحِ مقدسہ " کا سہارا ڈھونڈھ کر ان کے لیے نذرانے پیش کرنے لگا۔ کبھی اپنے

ہی ہم جنس لوگوں کو اس بلند و بالا مسند پر بٹھا کر تصور ہی تصور میں سوچتا رہا کہ یہی ہیں جو اس کی مدد کر سکتے ہیں اور اس پر ہی کیا بس ہے اس انسان نے پستی کی اس منزل کو بھی چھونے سے گریز نہیں کیا کہ جہاں اس "امداد رس قوت" کی تخلیق خود اس نے مٹی، پتھر، لکڑی یا کسی بھی مادی شے سے اپنے ہاتھوں کی اور پھر اسی کو اپنی حاجت روائی اور مدد کے لیے پکارا کیا۔

یہ معاملہ کوئی ماضی کی داستانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ آج بھی انسان اپنی ترقی کی اعلیٰ منازل پر متمکن ہونے کے باوجود اس مرضِ کہنہ سے شفایاب نہیں ہوا۔ پھر یہ "ما فوق الفطرت طاقت" کے پہچاننے میں حضرت انسان کی غلطی ایک ہی نوعیت کی نہ تھی۔ کچھ لوگوں نے اس ہستی اعلیٰ کو پہچانا اور مانا مگر اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وسیلوں کی تلاش شروع کی اور کہا کہ اصل منبعِ جود و سخا تو وہی ذات ہے مگر ہماری پہنچ سے وہ باہر ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے کچھ واسطے ہونے چاہئیں، لہٰذا ہم ان "چھوٹے خداؤں" کو بطور سفارشی پوجتے ہیں تاکہ بڑے اور اصلی خدا تک ہماری دعاؤں کو پہنچا دیں۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ ——— (الزمر آیت: ۳)

ترجمہ: ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں ———

کچھ لوگوں نے مختلف حاجات کو مختلف قوتوں کے ذریعے حاصل کرنے کے لیے ہر قوت کو ایک الگ شعبے کا انچارج گردانا اور ہر کام کے لیے متعلقہ محکمے کے سربراہ کے سامنے چڑھاوے چڑھا کر دعائیں مانگی جانے لگیں۔ خانہ کعبہ میں فتح مکہ سے پہلے تک جو ۳۶۰ بت رکھے گئے تھے ان میں سے کئی بارش برسانے کے لیے، کئی اولاد دینے کے لیے، کئی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے۔ کئی کاروبارِ تجارت چمکانے کے لیے، کئی جنگوں میں فتح بخشنے کے لیے اور کئی دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

بعض لوگوں نے برائی اور مصیبت سے بچنے کے لیے الگ قوتوں کو اپنا مددگار بنا رکھا تھا اور بھلائی اور خیر کے حصول کے لیے الگ آستانے مقرر تھے۔ غرضیکہ یہ موضوع بہت مفصل ہے اور اس سلسلے میں انسان کی ٹھوکریں مضحکہ خیز بھی ہیں اور دردناک بھی۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ان غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے دو طریقے اختیار کیے ایک تو یہ کہ انسان کے اپنے جسم میں ایک آلہ لگا دیا جو اسے غلط اور صحیح کے پہچاننے میں مدد دے سکے۔ اس کو ضمیر کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مثلاً سورہ البلد آیت : ۱۰ میں فرمایا " وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ " (ہم نے دونوں نمایاں راستے (خیر و شر) انسان کو واضح طور پر دکھا دیئے ہیں) سورہ الشمس آیت : ۸ میں فرمایا " فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا " (پھر انسان پر بدی اور پرہیز گاری الہام کردی) سورہ الدہر آیت ۳، میں کہا گیا۔ " إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا " (ہم نے انسان پر راستہ واضح کردیا ہے اب اس کو اختیار ہے کہ شکر گزار بنے یا کفر کرے) ـــــــ یہ اندرونی صلاحیت امتیاز در خیر و شر بھی انسان کے امتحان کے لیے کافی ہو سکتی تھی مگر خالق باری نے بکمال رحمت و شفقت انسانوں کی اس اندرونی رہنمائی کے ساتھ بیرونی ہدایت کا انتظام بھی کیا۔ یہ بیرونی ہدایت اللہ کے انبیاء و رسل کی آمد کی صورت میں مہیا ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے انسانی نسل چلائی اور انہیں کو نبوت سے سرفراز فرما کر سلسلۂ رسالت کا آغاز کیا۔ پھر اس کے بعد ہر ملک میں جہاں جہاں حضرت آدم کی اولاد پھیلتی چلی گئی، اللہ کے نبی مبعوث ہوتے رہے۔

" وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ " (فاطر، آیت ۲۴) ترجمہ :۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

" لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ " ہر قوم کے لیے ایک ہدایت والا مقرر کیا گیا۔ (الرعد آیت ۷) اور یہ بھی واضح کر دیا کہ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب میں گرفتار نہیں کیا جاتا جب تک کہ ان کی طرف رسول بھیج کر حجت پوری نہیں کردی جاتی۔ " وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا " (بنی اسرائیل آیت ۱۵)

ہر امت اور ہر ملک کی جانب انبیاء و رسل بھیجے جاتے رہے، حتیٰ کہ تکمیل نبوت و اکمال دین کا مرحلہ آ گیا۔ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری نوع انسانی کی جانب بغیر کسی علاقائی تقسیم، جغرافیائی حد بندی، نسلی امتیاز، لسانی اختلاف اور زمانی بُعد کے ہادی و رہنما بنا کر بھیج دیا۔

قُلْ يَآيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

(الاعراف' آیت' ۱۵۸)

ترجمہ: (اے محمدؐ) کہہ دو، اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔۔۔۔۔۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

(سبا' آیت' ۲۸)

ترجمہ:۔ ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

آپ جس طرح تمام انسانوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے اسی طرح آپ نے تمام انبیاء کے مشن کی تکمیل بھی کر دی اور آپ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا۔ آپ کا پیغام قیامت تک دنیا میں موجود رہے گا۔ اور روشنی کے طلب گاروں کو روشنی و ہدایت سے مستفید کرتا رہے گا آپ کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا نہ کسی نبی کے آنے کی ضرورت و حاجت ہے۔

حضرت آدمؑ سے لے کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء نے انسانوں کو یہی تعلیم دی کہ انہیں اپنا سر صرف ایک اللہ واحد و قہار کے سامنے جھکانا چاہیئے اور اپنی حاجات کی طلب کے لیے بھی اسی اللہ کے آگے ہاتھ پھیلانے چاہئیں۔ اس کے علاوہ کسی میں نہ ہمت ہے نہ کسی کے پاس اختیار کہ وہ تمہاری ضروریات پوری کر سکے۔ اللہ کے علاوہ دوسری ہستیوں سے دعائیں مانگنے والوں کے بارے میں قرآن میں واضح کیا گیا ہے کہ نہ تو وہ کسی کی دعائیں سن سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو پورا کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس اصول کو یہاں تک واضح کر دیا کہ اللہ کے سوا یہ لوگ ایک مکھی تک نہیں بنا سکتے اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین کر لے جائے تو اسے واپس نہیں لا سکتے۔ (سورۃ الحج' آیت ۳) پھر سورۂ فاطر' آیت' ۱۳ میں فرمایا کہ جن کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے سوراخ میں باریک سے چھلکے کی بھی ملکیت نہیں رکھتے

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ

اس مضمون کو قرآن مجید میں کئی مواقع پر بیان کیا گیا ہے۔ سورہ حج میں ارشاد فرمایا:۔

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ : الحج ۱۲

(یہ ان لوگوں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں جن کے فائدے سے جن کا نقصان زیادہ قریب ہے)

یوں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی بھی نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا مگر یہاں نفع و نقصان سے مراد یہ ہے کہ نفع تو ظاہر ہے کہ ان دروازوں سے کسی کو مل نہیں سکتا[1] بہر حال نقصان پہنچ جاتا ہے اور وہ یوں کہ جب اللہ کے سوا کسی کو مدد کے لیے پکارا تو احکام خداوندی کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا اور یہ خسارۂ ایمان و خذلانِ آخرت ہے۔

دُعا کے لیے اللہ تعالیٰ کو جب بھی پکارا جاتا ہے تو وہ اس پکار کو سنتا ہے اور پکارنے والے کی دادرسی کرتا ہے۔ قرآن مجید اس سلسلہ میں واضح فیصلہ کرتا ہے۔ سورۂ البقرہ، آیت ۱۸۶ میں فرمایا:۔

اِنِّیْ سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۝

ترجمہ: (اے نبیؐ) اگر میرے بندے میرے متعلق تم سے پوچھیں، تو انہیں بتادو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ یہ بات ان کو بتادو تاکہ وہ راہِ راست پالیں۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان براہِ راست تعلق ہے اور یہ تعلق ایسا قریبی ہے کہ بندہ جب اور جس جگہ اللہ سے ملنا چاہے اسے کسی دربان سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی بھول بھلیوں سے گزر کر اس شہنشاہِ مطلق کے قصرِ عالی مدار تک پہنچنا ہے۔ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ وہ خالق و مالک ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق، آیت ۱۶)

اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت پسند ہے کہ اس کے بندے اسے مدد کے لیے پکاریں اور

---

[1] یہ الگ بات ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز ملے اور وہ اپنی حماقت و جہالت سے اسے بجائے اللہ کے کسی اور کی طرف منسوب کرتا رہے۔ اس حالت میں انسان سخت دھوکے میں مبتلا رہتا ہے۔

جب بندے اسے مدد کے لیے نہیں پکارتے تو یہ بات اس کے غضب کا باعث بنتی ہے۔
سورۃ الفرقان آیت ۷۷ میں فرمایا قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ یعنی (اے نبی) کہہ دو کہ میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو مدد کے لیے نہ پکارو۔ سورۃ المؤمن میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۔ (آیت ۶۰)

ترجمہ: تمہارا رب کہتا ہے " مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"

یہاں عبادت بمعنی دعا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے " الدعاء ھو العبادۃ " گویا اللہ سے مانگنے والے تو اس کے محبوب ہیں اور اس کے در سے منہ موڑنے والے اسے سخت ناپسند۔ پھر اس کے در کو چھوڑ کر دوسرے دروازوں سے بھیک مانگنے والوں کا انجام کیا ہوگا جبکہ ان کے وہ مزعوم حاجت روا خود قیامت کے روز اللہ کے دربار میں ان عقیدت مندانِ ابلہ سے بیزاری کا اظہار کر دیں گے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے۔ " وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ "
دعا کی حقیقت وقبولیت اور دعا کی اہمیت وطریق کار کے سلسلے میں قرآن وحدیث میں بڑے عام فہم انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ذیل میں ہم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم حق گو سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔ تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۴۱۸، ۴۱۹ پر بیان کرتے ہیں کہ دعا قبول کرنے اور نہ کرنے کے جملہ اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں لہٰذا اس کے علاوہ دوسروں سے دعائیں مانگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے پھر لکھتے ہیں کہ اس نکتے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے تین باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔

پہلی بات:۔ جس سے دعا مانگی جائے اس کے بارے میں داعی کا تصور

" دعا آدمی صرف اس ہستی سے مانگتا ہے جس کو وہ سمیع وبصیر اور فوق الفطری اقتدار

(SUPER NATURAL POWER) کا مالک سمجھتا ہے، اور دعا مانگنے کا محرک دراصل

آدمی کا یہ اندرونی احساس ہوتا ہے کہ عالمِ اسباب کے تحت فطری ذرائع و وسائل اس کی کسی تکلیف کو رفع کرنے یا اس کی کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں یا کافی ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔ اس لیے کسی فوق الفطری اقتدار کی مالک ہستی سے رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ اس ہستی کو آدمی بے دیکھے پکارتا ہے۔ ہر وقت، ہر جگہ، ہر حال میں پکارتا ہے۔ خلوت کی تنہائیوں میں پکارتا ہے۔ باآواز بلند ہی نہیں، چپکے چپکے بھی پکارتا ہے، بلکہ دل ہی دل میں اس سے مدد کی التجائیں کرتا ہے۔ یہ سب کچھ لازماً اس عقیدے کی بناء پر ہوتا ہے کہ وہ ہستی اس کو ہر جگہ ہر حال میں دیکھ رہی ہے۔ اس کے دل کی بات بھی سن رہی ہے، اور اس کو ایسی قدرت مطلقہ حاصل ہے کہ اسے پکارنے والا جہاں بھی ہو، وہ اس کی مدد کو پہنچ سکتی ہے اور اس کی بگڑی بنا سکتی ہے۔ دعا کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھنا آدمی کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ جو شخص اللہ کے سوا کسی اور ہستی کو مدد کے لیے پکارتا ہے وہ درحقیقت قطعی اور خالص اور صریح شرک کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ وہ اس ہستی کے اندر ان صفات کا اعتقاد رکھتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں۔ اگر وہ اس کو ان خدائی صفات میں اللہ کا شریک نہ سمجھتا تو اس سے دعا مانگنے کا تصور تک کبھی اس کے ذہن میں نہ آسکتا تھا۔"

دوسری بات :- اختیارات کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے

" دوسری بات جو اس سلسلے میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ وہ یہ ہے کہ کسی ہستی کے متعلق آدمی کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ اختیارات کی مالک ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فی الواقع مالکِ اختیارات ہو جائے۔ مالکِ اختیار ہونا تو ایک امرِ واقعی ہے جو کسی کے سمجھنے یا نہ سمجھنے پر موقوف نہیں ہے، جو درحقیقت اختیارات کا مالک ہے وہ بہرحال مالک ہی رہے گا، خواہ آپ اسے مالک سمجھیں یا نہ سمجھیں، اور جو مالک نہیں ہے اس کو محض یہ بات کہ آپ نے اسے مالک سمجھ لیا ہے، اختیارات میں ذرہ برابر بھی کوئی حصہ نہ دلوا سکے گی۔ اب یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ قادرِ مطلق، مدبرِ کائنات، سمیع و بصیر ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور وہی کُلی طور پر اختیارات کا مالک ہے۔ دوسری کوئی ہستی بھی اس پوری کائنات

میں ایسی نہیں ہے جو دعائیں سننے اور ان پر قبولیت یا عدم قبولیت کی صورت میں کوئی کارروائی کرنے کے اختیارات رکھتی ہو۔ اس امرِ واقعی کے خلاف اگر لوگ اپنی جگہ کچھ انبیاء اور اولیاء اور فرشتوں اور جنوں اور سیاروں اور فرضی دیوتاؤں کو اختیارات میں شریک سمجھ بیٹھیں تو اس سے حقیقت میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق رونما نہ ہوگا۔ مالک مالک ہی رہے گا اور بے اختیار بندے بندے ہی رہیں گے۔"

تیسری بات :- ماسوی اللہ کسی کو مدد کے لیے پکارنا جہالت و حماقت ہے

"تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے دعا مانگنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص درخواست لکھ کر ایوانِ حکومت کی طرف جائے مگر اصل حاکمِ ذی اختیار کو چھوڑ کر وہاں جو دوسرے سائلین اپنی حاجتیں لیے بیٹھے ہوں، ان میں سے کسی ایک کے آگے اپنی درخواست پیش کر دے اور پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس سے التجائیں کرتا چلا جائے کہ حضور ہی سب کچھ ہیں آپ ہی کا یہاں حکم چلتا ہے۔ میری مراد آپ ہی بر لائیں گے تو بر آئے گی۔ یہ حرکت اول تو بجائے خود سخت حماقت و جہالت ہے لیکن ایسی حالت میں یہ انتہائی گستاخی بھی بن جاتی ہے جبکہ اصل حاکمِ ذی اختیار سامنے موجود ہو اور عین اس کی موجودگی میں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے سامنے درخواستیں اور التجائیں پیش کی جارہی ہوں۔ پھر یہ جہالت اپنے کمال پر اس وقت پہنچ جاتی ہے جب وہ شخص جس کے سامنے درخواست پیش کی جارہی ہو خود بار بار اس کو سمجھائے کہ میں تو خود تیری ہی طرح کا ایک سائل ہوں، میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ اصل حاکم سامنے موجود ہیں، تو ان کی سرکار میں اپنی درخواست پیش کر، مگر اس کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود یہ احمق کہتا ہی چلا جائے کہ میرے سرکار تو آپ ہیں، میرا کام آپ ہی بنائیں گے تو بنے گا۔"

تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۴۲۰ تا ۴۲۲ میں دعا کے بارے میں مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

دعا عین عبادت ہے اور دعا سے منہ موڑنا تکبر

"دعا عین عبادت اور جانِ عبادت ہے۔" دعا مانگنا عین تقاضائے بندگی ہے

اور اس سے منہ موڑنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی تکبر میں مبتلا ہے اس لیے اپنے خالق و مالک کے آگے اعترافِ عبودیت کرنے سے کتراتا ہے۔"

پھر احادیث نبویؐ سے اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" حضرت نعمانؓ بن بشیر کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا، اِنَّ الدُّعاھو العبادۃ[1]"

نیز " حضرت انس کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا :۔

" اَلدُّعَاءُ مُخُ الْعِبَادَۃِ۔ دُعا مغز عبادت ہے (بحوالہ ترمذی)"

آگے حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ " حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مَنْ لَمْ یَسْئَلِ اللّٰہ یَغْضَبْ علیہ یعنی جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے۔" (ترمذی)

دُعا تقدیر اور قضا کو بدل سکتی ہے :۔ " اس مقام پر پہنچ کر وہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے جو بہت سے ذہنوں میں اکثر الجھن ڈالتا رہتا ہے۔ لوگ دعا کے معاملے پر اس طرح سوچتے ہیں کہ جب تقدیر کی برائی اور بھلائی اللہ کے اختیار میں ہے اور وہ اپنی غالب حکمت و مصلحت کے لحاظ سے جو فیصلہ کر چکا ہے۔ وہی کچھ لازماً رونما ہو کر رہنا ہے تو پھر ہمارے دعا مانگنے کا حاصل کیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو آدمی کے دل سے دعا کی ساری اہمیت نکال دیتی ہے۔ اور اس باطل خیال میں مبتلا رہتے ہوئے اگر آدمی دعا مانگے بھی تو اس کی دعاؤں میں کوئی روح باقی نہیں رہتی۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت[2] اس غلط فہمی کو دو طریقوں سے دور کرتی ہے، اوّلاً اللہ تعالیٰ بالفاظِ صریح فرما رہا ہے کہ " مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔" اس سے صاف معلوم ہوا کہ قضا اور تقدیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس نے ہماری طرح معاذ اللہ، خود اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بھی باندھ دیئے ہوں، اور دعا قبول کرنے کے اختیارات اس سے سلب ہو گئے ہوں۔ بندے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو ٹالنے یا بدل دینے کی طاقت نہیں رکھتے،

---

[1] بحوالہ مسند امام احمد۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ ابن ابی حاتم۔ ابن جریر۔

[2] سورۃ المومن آیت ۶۰

مگر اللہ تعالیٰ خود یہ طاقت ضرور رکھتا ہے کہ کسی بندے کی دعائیں اور التجائیں سن کر اپنا فیصلہ بدل دے۔

دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دُعا خواہ قبول ہو یا نہ ہو، بہرحال ایک فائدے اور بہت بڑے فائدے سے وہ کسی صورت خالی نہیں ہوتی، اور وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کر کے اور اس سے دُعا مانگ کر اس کی آقائی و بالادستی کا اعتراف اور اپنی بندگی و عاجزی کا اقرار کرتا ہے۔ یہ اظہار عبودیت بجائے خود عبادت بلکہ جانِ عبادت ہے جس کے اجر سے بندہ کسی حال میں بھی محروم نہ رہے گا، قطع نظر اس سے کہ وہ خاص چیز اس کو عطا کی جائے یا نہ کی جائے جس کے لیے اس نے دعا کی تھی[1]

ان سطور کی مزید تشریح کے لیے مولانا محترم احادیث نبویؐ سے استدلال کرتے ہیں۔

"حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ (قضا کو کوئی چیز نہیں ٹال سکتی مگر دعا) (ترمذی)

یعنی اللہ کے فیصلے کو بدل دینے کی طاقت کسی میں نہیں ہے، مگر اللہ خود اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے، اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب بندہ اس سے دعا مانگتا ہے[2]

دُعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی: "حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا مِنْ اَحَدٍ يَدْعُوْ بِدُعَاءٍ اِلَّا اٰتَاهُ اللّٰهُ مَا سَاَلَ اَوْ كَفَّ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهٗ مَالَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ (ترمذی) یعنی آدمی جب کبھی اللہ سے دعا مانگتا ہے، اللہ یا تو اسے وہی چیز دے دیتا ہے جس کی اس نے دعا کی تھی، یا اسی

---

[1] اس چیز کا عطا کیا جانا یا نہ کیا جانا بھی حکمت پر مبنی ہوتا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

[2] مولانا محترم کی اس تشریح کی تائید ان اقوالِ ربانی سے ہوتی ہے:۔

"لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ" (الانبیاء، ۲۲) "اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ" (الحج ۱۸) اور اس مطلق العنان اختیار کے ساتھ اس کا اپنا ہی یہ حکم ہے۔ "اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ" (البقرہ، ۱۸۶) اور "اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" (المومن، ۶۰) پس قضا و تقدیر جو اسی کے حکم کی پابند ہے وہ اس کے حکم سے بدل بھی سکتی ہے۔

درجے کی کوئی بلا اس پر آنے سے روک دیتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔

اسی سے ملتا جلتا مضمون ایک دوسری حدیث میں ہے جو حضرت ابو سعید خدری نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ اس میں آپ کا ارشاد ہے کہ:

مَامِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُوْ بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيْهَا اِثْمٌ وَّلَا قَطِيْعَةُ رَحِمٍ اِلَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ اِحْدٰى ثَلَاثٍ، اِمَّا اَنْ تُعَجَّلَ لَهٗ دَعْوَتُهٗ، وَاِمَّا اَنْ يَّدَّخِرَهَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ، وَاِمَّا اَنْ يُّصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا (مسند احمد)

یعنی ایک مسلمان جب بھی دعا مانگتا ہے بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے۔ یا تو اس کی وہ دعا اسی دنیا میں قبول کر لی جاتی ہے۔ یا اسے آخرت میں اجر دینے کے لیے محفوظ رکھ لیا جاتا ہے۔ یا اسی درجہ کی کسی آفت کو اس پر آنے سے روک دیا جاتا ہے۔"

مندرجہ بالا حدیثِ پاک کی روشنی میں اگر سوچا جائے تو کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ دعا مومن کے لیے ہر حال میں فائدہ مند ہے خواہ اس کی ظاہر بین آنکھیں اسے دیکھ سکیں یا نہ دیکھ سکیں۔ وہ مومن جس کے سامنے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ ارشاد ہر دعا مانگنے کے وقت مستحضر رہے اسے کبھی مایوسی نہیں ہو سکتی۔ وہ دعا اس یقین کے ساتھ کرے گا کہ اس کا فائدہ تو مانگتے ہی مقدر ہو چکا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ فائدہ مجھے کب حصول ہوگا تو اس کا دارومدار اللہ کی حکمتِ بالغہ اور مصلحتِ عظمیٰ پر ہے اور وہی جانتا ہے کہ اس دعا کا نفع اپنے بندے کو کس مخصوص صورت میں پہنچائے۔

اس حدیث میں مومن کے لیے یہ بات بہت بڑا سہارا ہے کہ اس کی دنیا میں قبول نہ کی جانیوالی دعائیں اس کی آخرت کا محفوظ سرمایہ بن جاتی ہیں۔ جو بندہ اطمینانِ قلب اور صبر کے ساتھ اپنے مالک کے سامنے مناجات کرتا رہتا ہے اور دعاؤں کا ظاہری نتیجہ برآمد نہ ہونے کے باوجود کبھی بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرتا اور نہ ہی مایوس ہو کر دعائیں مانگنا چھوڑ دیتا ہے اس کی قسمت کے کیا کہنے! اس کی ایک ایک دعا قیامت کے دن کہ جس دن سے زیادہ محتاجی کا دن اس کے لیے کبھی طلوع نہیں ہوا اس کے سامنے آ کھڑی ہوگی

اور مولائے کریم اس سے پوچھے گا: " بتا میرے بندے! اس دعا کے بدلے تیرا کون سا گناہ معاف کر دوں اور اس دعا کے بدلے تیرے کتنے درجات بلند کر دوں۔" تو بندہ اس دن خوشی سے جھوم اٹھے گا اور اس کے دل کے ایک گوشے میں اس ناقابل بیان مسرت کے ساتھ ایک ہلکی سی حسرت بھی انگڑائیاں لے رہی ہو گی کہ کاش دنیا میں اس کی کوئی بھی دعا قبول نہ ہوتی تاکہ آج اپنے محفوظ سرمائے سے وہ اور زیادہ مستفید ہو سکتا۔

پھر یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانکنے کی استطاعت ہم میں نہیں ہے۔ ہمیں کوئی علم نہیں ہوتا کہ ہم خوش و خرم بیٹھے کسی بڑی خوشی کے لیے نہایت خلوص کے ساتھ اپنے رب سے دعا کر رہے ہوں اور ہماری آنکھوں سے اوجھل مگر ہماری قسمت کے بالکل قریب کوئی حادثہ ناگہانی آ پہنچا ہو۔ ہم تو اس سے بے خبر ہو سکتے ہیں مگر خالق کائنات تو خبیر و بصیر ہے۔ وہ اپنی رحمت و شفقت سے اس حادثے کو ہماری دعا کے بدلے میں روک دیتا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ مصیبت ہم پر وارد ہو جاتی اور " بڑی خوشی" کی دعا بھی قبول ہو جاتی تو عین ممکن ہے کہ ایسی حالت میں وہ خوشی بجائے خوشی ثابت ہونے کے ہمارے زخموں پر مزید نمک پاشی کا باعث بنتی۔ پس مومن کی دعا کبھی ضائع نہیں ہو سکتی۔ اسے اپنی دعا کے بارے میں پورا الیقین رکھنا چاہیئے کہ اس کی دعا اس کے کھاتے میں ہر حال میں جمع ہو رہی ہے۔

دُعا کس طرح مانگی جائے: ۔ دعا میں بندے کو کیا انداز اختیار کرنا چاہیے اور کس طرح اپنی حاجات خدا کے سامنے پیش کرنی چاہئیں۔ اس سلسلے میں مولانا محترم نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث پیش کی ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

" حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: - اذا دعی احدکم فلا یقل اللّٰھم اغفرلی ان شئت، ارحمنی ان شئت، ارزقنی ان شئت، ولیعزم مسئلتہ (بخاری) یعنی جب تم سے کوئی شخص دعا مانگے تو اسے یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ خدایا مجھے بخش دے اگر تو چاہے، خدایا مجھ پر رحم کر اگر تو چاہے، مجھے رزق دے اگر تو چاہے، بلکہ اسے قطعیت کے ساتھ کہنا چاہیئے کہ خدایا میری فلاں حاجت پوری کر۔ دوسری حدیث حضرت ابوہریرہؓ

نے حضور اکرم سے یوں روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ "اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ (ترمذی) اللہ سے دُعا مانگو اس یقین کے ساتھ کہ وہ قبول فرمائے گا۔"

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں انسان کو اپنی حاجت پیش کرتے وقت یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ " اے اللہ اگر تو چاہے تو یہ قبول کرے۔" کیونکہ اس سے احساسِ بے نیازی اور اندازِ بے ادبی پایا جاتا ہے جبکہ اللہ کے ہاں عاجزی و انکساری محبوب ہے۔ اس کے علاوہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیثِ قدسی میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔" اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ" یعنی میں اپنے بندے کے (میرے بارے میں) گمان کے مطابق اس سے معاملہ کرتا ہوں ــــ تو انسان کو خدا سے دعا کرتے وقت یہ یقین کرنا چاہیئے کہ اس کی دعا قبول ہوگی۔

کون سی دُعا قابلِ قبول نہیں ہوتی :۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے مولانا محترم نے حضرت ابوہریرہؓ کی بیان کردہ حدیث بحوالہ مسلم نقل کی ہے۔ جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

" یُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَالَمْ یَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِیْعَۃِ رَحِمٍ مَالَمْ یَسْتَعْجِلْ، قِیْلَ مَا الْاِسْتِعْجَالُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ یَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ اَرَ یَسْتَجَابُ لِیْ فَیَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِکَ وَیَدَعُ الدُّعَاءَ یعنی بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے، اور جلد بازی سے کام نہ لے۔ عرض کیا گیا جلد بازی کیا ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا، جلد بازی یہ ہے کہ آدمی کہے میں نے بہت دعا کی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری دعا قبول نہیں ہوتی اور یہ کہہ کر آدمی تھک جائے اور دُعا مانگنی چھوڑ دے۔"

اللہ سے دعا مانگنے والے اس کے محبوب ہیں :۔

" حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لَیْسَ شَیْءٌ اَکْرَمَ عَلَی اللّٰہِ مِنَ الدُّعَاءِ (ترمذی، ابن ماجہ) اللہ کی نگاہ میں دُعا سے بڑھ کر کوئی چیز باوقعت نہیں ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: سَلُوْا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ

فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یُّسْأَلَ (ترمذی) اللہ سے اس کا فضل مانگو کیونکہ اللہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس سے مانگا جائے لہ"

دعا دافع بلا ہے :۔ سید مودودی نے حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کی روایت سے ایک حدیث لکھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

اِنَّ الدُّعَاءَ یَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ یَنْزِلْ فَعَلَیْکُمْ عِبَادَ اللّٰہِ بِالدُّعَاءِ (ترمذی۔ مسند احمد)

دعا بہر حال نافع ہے ان بلاؤں کے معاملے میں بھی جو نازل ہو چکی ہیں اور ان کے معاملے میں بھی جو نازل نہیں ہوئیں۔ پس اے بندگانِ خدا تم اللہ سے ضرور دعا مانگا کرو۔"

جو بلائیں ابھی نازل نہیں ہوئیں ان کے بارے میں تو وضاحت آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو قضا کو بدل سکتا ہے اور جو بلائیں نازل ہو چکی ہوں ان سے نجات اور بچاؤ کی واحد صورت بھی یہی ہے کہ اللہ سے رجوع کیا جائے اور اس کی استعانت طلب کی جائے کیونکہ وہ جس نے بلا بھیجی ہے وہ اسے دور بھی کر سکتا ہے۔

ہر چیز اللہ سے مانگو :۔ "حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " یَسْأَلُ اَحَدُکُمْ رَبَّہٗ حَاجَتَہٗ کُلَّہَا حَتّٰی یَسْأَلَ شِسْعَ نَعْلِہٖ اِذَا انْقَطَعَ (ترمذی) تم میں سے ہر ایک کو اپنی ہر حاجت خدا سے مانگنی چاہیئے، حتیٰ کہ اگر اس کی جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا سے دعا کرے۔"

اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں "یعنی جو معاملات بظاہر آدمی کو اپنے اختیار میں محسوس ہوتے ہیں ان میں بھی تدبیر کرنے سے پہلے اسے خدا

لہ لوگوں سے جب مانگا جاتا ہے تو وہ اس کا برا مناتے ہیں اور ان کے دلوں میں تنگی اور سینوں میں گھٹن پیدا ہوتی ہے مگر خالقِ کائنات کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے نہ مانگا جائے تو ناراضگی کا اظہار کرتا ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے :۔

لَا تَسْأَلَنَّ بُنَیَّ اٰدَمَ حَاجَۃً ۔۔۔ وَاسْأَلْ الَّذِیْ اَبْوَابُہٗ لَا تُحْجَبُ

اَللّٰہُ یَغْضَبُ اِنْ تَرَکْتَ سُؤَالَہٗ ۔۔۔ وَابْنُ اٰدَمَ حِیْنَ یُسْأَلُ یَغْضَبُ

سے مدد مانگنی چاہیئے، اس لیے کہ کسی معاملے میں بھی ہماری کوئی تدبیر خدا کی توفیق و تائید کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی اور تدبیر سے پہلے دعا کے معنی یہ ہیں کہ بندہ ہر وقت اپنی عاجزی اور خدا کی بالادستی کا اعتراف کر رہا ہے۔"

اسلام میں افراط و تفریط نہیں ہے۔ یہاں تدبیر کے بغیر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا اور امید لگانا کہ کچھ نہ کچھ مل جائے گا کوئی پسندیدہ حرکت نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی قوتِ بازو اور سعی و جہد کو ہی سب کچھ سمجھ لینا اور اللہ کی ذات پر بھروسہ نہ رکھنا بھی گمراہی و ضلالت ہے۔ اسلام میں دونوں باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ کوشش و محنت اور توکل و رضا۔

دُعا کے لیے کچھ لازمی شرائط

جس طرح قرآن و حدیث میں اللہ اور اللہ کے رسول نے دعا کی اہمیت واضح کی ہے اسی طرح کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دعا کے لیے کچھ لازمی شرائط بھی انسانوں کی رہنمائی کے لیے ارشاد کیے گئے ہیں۔ یوں تو ان شرائط کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن یہاں اختصار کے ساتھ کچھ موٹی موٹی شرائط بیان کی جاتی ہیں:-

(۱) **خلوصِ دین**:- خلوصِ دین سے مراد یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے مطابق قدم اٹھائے۔ دعا جس کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ اس کے احکام کی پیروی لازمی امر ہے ورنہ دعا کے اندر روح نہیں پیدا ہو سکتی۔ قرآن مجید میں یہ مضمون کئی مقامات پر واضح کیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف آیت ۲۹ میں فرمایا "اُدْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ" (اسی (اللہ) کو پکارو اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے)

(۲) **عجز و اخفاء**:- دعا کے لیے دل کی کیفیت و حالت کا بدل جانا بھی نہایت اہم چیز ہے۔ جس طرح غافل و بے فکر دل کے ساتھ عبادت کوئی قبولیت حاصل نہیں کر سکتی اسی طرح عاجزی کے بغیر دعا میں اثر پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی کہ اللہ سے دعا کرتے وقت اخفا پسندیدہ امر ہے۔ قرآن مجید سورۂ اعراف آیت ۵۵ میں حکم دیا گیا:-

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے ـــ

حضرت زکریا کی دعا کا ذکر سورۂ مریم آیت ۲ میں کرتے ہوئے فرمایا، اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَاءً خَفِیًّا جب (زکریا نے) اپنے ربّ کو چپکے چپکے پکارا۔ اسی طرح قرآن مجید میں حضور اکرمؐ کو حکم دیا گیا واذکُرْ رَبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعاً وَّخِیْفَۃً وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ (اعراف آیت ۲۰۵) اور اپنے رب کا ذکر اپنے دل میں عاجزی اور خوف سے بغیر آواز کی بلندی کے۔" یہاں ذکر کا لفظ ذکر الٰہی اور دعا دونوں پر حاوی ہے۔

عاجزی وگڑگڑاہٹ اور قلبی حضوری تو دعا کے لیے ایک ایسا لازمی جزو ہے جس کے بغیر دعا کا تصوّر مکمل نہیں ہو سکتا تاہم اخفا کے معاملے میں کچھ آزادی ضرور ہے۔ بعض مواقع پر خصوصاً اجتماعی دعاؤں میں اخفا کی جگہ اظہار بھی درست ہے۔ ایک آیت قرآنی سے بھی اس بات کی گنجائش نکلتی ہے کہ دُعا بآوازِ متوسط کی جا سکتی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۱ میں کہا گیا " وَلَا تَجْھَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ بِھَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا " اس آیت میں صلاۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نماز کے ہیں مگر اس میں دعا کے معانی بھی پائے جاتے ہیں خصوصاً اس آیت میں اس سے پہلے کے الفاظ ان معانی کی تائید کرتے ہیں۔ " قُلِ ادْعُوا اللہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی "

اس کے باوجود انفرادی دعاؤں میں اخفا ہی بہتر ہے۔ بعض بزرگوں کے نزدیک تو خفیہ دعا جہری دعا پر ستر گنا فضیلت رکھتی ہے۔

(۳) **خوف ورجا** :- دعا کے اجزائے ترکیبی میں خوف ورجا بھی نہایت درجہ اہم عناصر ہیں۔ دعا کے وقت اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے جلال کی ہیبت جسم ودماغ پر طاری ہو اور اس کی رحمت والفت کی اُمید سے دل وروح معمور ہو۔ سورۂ اعراف میں فرمایا۔ " اُدْعُوْہُ خَوْفًا وَّطَمَعًا " (آیت ۵۶) اس کو پکارو خوف اور طمع کے ساتھ۔ سورۂ انبیاء میں اپنے نبیوں کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی جو مشترک صفات گنوائی ہیں ان میں کہا ہے " یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَھَبًا وَکَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ " (آیت ۹۰) یعنی (ہمارے یہ تمام پیغمبر) ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے سامنے جھکے ہوئے تھے۔

اللہ کے خوف سے کانپنا اور اس کی رحمت سے دل کو تسلی دینا مومنین کی امتیازی

صفت ہے! اللہ تعالیٰ نے سورہ السجدہ آیت ۱۶ میں اپنے بندگانِ خاص کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا، " تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا "۔ یعنی ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں۔

(۴) **راحت و آرام میں دعا مانگنا** :- عام طور پر انسانوں کا وطیرہ یہ ہے کہ جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو خدا کو مدد کے لیے پکارتے ہیں اور جب اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے تو اس کو یکسر بھول جاتے ہیں اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔ انسان کی اس افتادِ طبع کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ العنکبوت آیت ۶۵ میں فرمایا۔" فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ "۔ (جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خاص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں، پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں[1]

اللہ تعالیٰ سے مصیبت میں بھی دعا مانگنی ضروری ہے مگر آرام و راحت میں اس کو فراموش کر دینا سخت نمک حرامی اور پرلے درجے کی خود غرضی ہے۔ ترمذی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یوں منقول ہے۔

" مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَّسْتَجِيْبَ اللّٰهُ لَهُ عِنْدَ الشَّدَائِدِ فَلْيُكْثِرِ الدُّعَاءَ فِى الرَّخَاءِ "۔ جو شخص مصائب و محن میں قبولیت دعا کا خواہاں ہو اسے چاہیے کہ آرام و خوشحالی میں خدا کو یاد رکھے اور اس سے کثرت سے دعائیں مانگا کرے۔

---

[1] قرآن مجید میں انسان کی اس ذہنیت کی شدید مذمت کی گئی ہے ملاحظہ ہو :- سورہ الانعام آیات ۔۱۱-۱۲ اور ۲۲-۲۳- النحل آیات ۵۳ تا ۵۵ اور ۱۱۲- بنی اسرائیل آیات ۶۶ تا ۶۹- الکہف آیات ۳۵، ۳۶ اور ۴۲- النمل آیات ۶۲، ۶۳- الروم آیات ۳۳ تا ۳۶- لقمان آیت ۳۲- الزمر آیت ۸ اور ۴۹- المومن آیات ۸۳ تا ۸۵- حم السجدہ آیات ۵۱ اور ۵۵ القلم آیات ۱۷ تا ۳۲- الفجر آیات ۱۵- ۱۶-

(۵) **کسب حلال** :- دعا کی قبولیت کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ دعا کرنے والا حرام خوری سے مجتنب ہو اور رزقِ حلال سے گزر اوقات کرے۔ اس مضمون کی وضاحت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث خوب کرتی ہے فرمایا :-

" الرجل یطیل السفر اَشْعَثَ اَغْبَرَ وَ مطعمہٗ حرامٌ و مشربہٗ حرامٌ وَ مَلْبسہٗ حرامٌ وَ غذِّیَ بالحرام یَمُدُّ یَدَیْہِ اِلَی السَّمَاءِ یَارَبِّ یَارَبِّ فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰالِكَ "

ایک شخص لمبا سفر طے کر کے غبار آلودہ و پراگندہ بال آتا ہے۔ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اللہ کو پکارتا ہے۔ " اے میرے رب، اے میرے رب " اور حال یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام، پینا حرام، کپڑے حرام اور جسم اس کا پلا ہوا ہی حرام روٹیوں سے ہے پھر اس حال میں اس کی دعا قبول ہو تو کیوں کر۔ (مسلم - ترمذی - احمد)

پس معلوم ہوا کہ رزق حرام کے ساتھ کسی بھی حالت میں اور کتنی بھی عاجزی کے ساتھ دعا کی جائے اللہ کے ہاں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

(۶) **ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنا** :- یوں تو جس حال میں بھی دعا مانگی جائے (چلتے پھرتے۔ بیٹھے۔ لیٹے) دیگر شرائط اگر موجود ہوں تو دعا مقبول ہے مگر ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنے کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ہم عموماً ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں مگر ذہن میں اس کی اہمیت مستحضر رہنی چاہیئے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

" اِنَّ اللہَ حَیِیٌّ کَرِیْمٌ یَسْتَحْیِ اِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ یَدَیْہِ اَنْ یَرُدَّھُمَا صِفْراً خَائِبَتَیْنِ " (ترمذی - ابوداؤد - ابن ماجہ)

اللہ تعالیٰ شرم و حیا والا اور ذوالفضل والکریم ہے۔ جب کوئی دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کی بارگاہ میں دعا مانگتا ہے تو اسے اس کو خالی ہاتھ [illegible] واپس کرنے میں شرم آتی ہے۔

(۷) **کلماتِ طیبہ** :- اللہ تعالیٰ خود طیب و پاکیزہ ہے اور طیب پاکیزہ چیز ہی کو پسند کرتا ہے۔ دعا کے لیے کلمات طیبہ [illegible] کی بارگاہ میں پیش کیے جائیں تو اسے [illegible] پسندیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ قرآن [illegible] ہے۔ " الیہ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ "

پاکیزہ کلمات اللہ کی طرف اوپر جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں جن دعائیہ کلمات کی تلقین کی گئی ہے یا حدیث میں جو دعائیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں ان سے پاکیزہ کلمات کوئی نہیں ہو سکتے۔ پس ان ہی دعاؤں کا سہارا لینا چاہیئے۔ ویسے کسی بھی زبان میں بلکہ دل ہی دل میں بھی دعا کی جاسکتی ہے مگر کلمات و جذبات پاکیزہ ہونے چاہئیں۔

(۸) حمد و ثنا اور درود و سلام سے آغاز و اختتام دُعا :- دعا کے لیے مسنون طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے حمدِ باری تعالیٰ بیان کی جائے، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا جائے اس کے بعد دعائیں کی جائیں اور دعاؤں کے آخر میں پھر حمد باری و درود و سلام بر پیغمبرِ خدا کا اہتمام ہو۔ امام ترمذی نے اپنی جامع میں اور امام حاکم نے اپنی مستدرک میں تو ایک حدیث نقل کی ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر دعا سے پہلے دو رکعت نفل نماز بھی مسنون (واجب نہیں) ہے۔

ان اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر جب بھی کوئی بندۂ مومن دعا مانگے گا تو کبھی محرومی و ناکامی سے دوچار نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رحمتوں سے نوازے۔ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور ہمیں قیامت کے روز اپنے انعام یافتہ لوگوں کی صف میں شامل کرے۔

سبحان ربّک رب العزۃ عما یصفون ○ و سلام علی المرسلین ○ والحمد للہ ربِّ العالمین ○

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱)

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ٪

" تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے۔ رحمان اور رحیم ہے۔ روزِ جزا کا مالک ہے۔ (اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

یہ سورۂ فاتحہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو تحفہ میں عطا کی۔ اس سورہ کے ذریعے خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کو خود ہی دعا کرنے کا طریقہ سکھایا اور پھر ان کی اس دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ یہ قرآن مجید کی پہلی مکمل سورت ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اس سے قبل سورۂ علق (پارہ ۳۰) سورۂ مزمل (پارہ ۲۹) اور سورۂ مدثر (پارہ ۲۹) کی کچھ متفرق آیات نازل ہوئی تھیں۔

سورۂ فاتحہ اور قرآن مجید کے درمیان حقیقی تعلق مقدمہ اور کتاب کا نہیں بلکہ دعا اور جوابِ دعا کا ہے جیسا کہ مفکرِ اسلام سید مودودی نے تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۲ پر سورۃ الفاتحہ پر تعارفی نوٹ لکھتے ہوئے وضاحت فرمائی ہے۔ مرشد مودودی لکھتے ہیں:۔

"سورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے بندے کی جانب سے اور قرآن اس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔ بندہ دعا کرتا ہے کہ اے پروردگار! میری رہنمائی کر۔ جواب میں پروردگار پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی کہ جس کی درخواست تو نے مجھ سے کی ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا افتتاح ہی اللہ تعالیٰ نے ایک دعا کی تعلیم سے کیا ہے اور بندے کو دعا کے تمام آداب بحسن و خوبی سمجھا دیئے ہیں۔ دعا سے پہلے لازماً اس ہستی کی جانب ذہن جاتا ہے جس سے دعا مانگی جارہی ہے۔ پس حرفِ مدعا زبان پر لانے سے قبل بندہ اپنے خالق و مالک کی عظمت و رفعت کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ اس کے سامنے یہ اظہار بھی کرتا ہے کہ وہ اپنی جبینِ نیاز جھکانے کے لیے اس کے در کے سوا کوئی در موزوں نہیں سمجھتا لہٰذا مدد و نصرت کی طلب بھی وہ اسی در سے کرے گا۔

اس کے بعد بندہ اصل بات بارگاہِ ربّانی میں پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسے راہِ راست کا صحیح پتہ دیا جائے۔ اس دنیا میں بے شمار راہیں ہیں جن پر بندہ گامزن ہو سکتا ہے لیکن ان راہوں میں سیدھی اور درست راہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہی ہے "صراطِ مستقیم" بندہ اُسی صراطِ مستقیم کا طالب بن کر خدا کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس دعا کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اپنی آخری، لازوال اور مکمل کتابِ ہدایت بندے کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔

۲

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ (البقرہ، پارہ ۱۔ آیت ۱۲۶)

"اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنا دے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائیں، انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔"

یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ہے۔ یہ دعا انھوں نے

اس وقت مانگی تھی جب کہ آنجنابؑ مکہ معظمہ میں خدا کا سب سے پہلا گھر، خانہ کعبہ تعمیر کر رہے تھے۔ جس گھر کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے:۔

"اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝"

(آل عمران پارہ ۴، آیت: ۹۶)

(بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔)

اور حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اسی خانۂ خدا کے بارے میں کہا ہے ؎

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

حضرت خلیل اللہ کی یہ دعا اس موقع پر عین مناسب حال تھی۔ مکہ بے آب و گیاہ وادی میں واقع تھا۔ عرب کے عام حالات کے پیش نظر عسکری یلغار سے حفاظت کا بھی کوئی معقول انتظام موجود نہ تھا۔ ایسی حالت میں جب اللہ کا پیغمبر اس شہر میں خدا کے عبادت خانے کی بنیاد رکھ رہا تھا تو اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ اس شہر میں معاشرتی و سیاسی امن و سکون بھی رہے اور معاشی خوشحالی بھی۔ اس شہر میں چونکہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جگر گوشہ اسمٰعیل علیہ السلام کو آباد کیا تھا اور جب آباد کیا تھا اس وقت حالت یہ تھی کہ نہ کوئی سایہ تھا نہ آب و دانہ کا کوئی انتظام۔ تو حضرت ابراہیمؑ اب اپنی آرزو کو الفاظ کا جامہ پہنا کر حضورِ الٰہی میں پیش کر رہے تھے۔ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیمؑ کو مختلف آزمائشوں میں ڈالا اور وہ ہر آزمائش میں کامیاب ثابت ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا۔ "اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ" یعنی "اے ابراہیم میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" یہ مژدہ سنتے ہی حضرت ابراہیم نے سوال کیا۔ "وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ" (اے پروردگار کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے) تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں دو ٹوک الفاظ میں فرما دیا تھا۔ "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝" (ظالموں سے میرا یہ وعدہ نہیں ہے)۔ یعنی تیری اولاد میں سے جو تیری پیروی کریں گے انہیں

تو قیادت و امامت سے سرفراز کیا جائے گا مگر جو اس راستے سے منہ موڑ جائیں گے وہ ظالموں کے زمرے میں شمار ہوں گے اور ظالموں کی سیادت کو اللہ کی تصدیق نہیں مل سکتی۔

اس مکالمہ کے بعد اب حضرت ابراہیمؑ نے جب دعا کی تو اس میں شہر کے امن وسکون کے بارے میں تو جزل بات کی مگر اہل شہر کے رزق کے بارے میں احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کیا کہ " اے اللہ جو تجھ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائیں انھیں ہر قسم کے پھلوں سے رزق وافر عطا فرما۔" اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، کہ دنیوی رزق اور مادی وسائل کا جہاں تک معاملہ ہے وہ تو سب اہالیان بستی کے لیے کھلے رکھوں گا لیکن منکرین کو آخرت میں عذاب جہنم کا مزہ چکھاؤں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا یہ اثر ہے کہ ہمیشہ تاریخ کے ہر دور میں اور سیاسی بحرانوں کے ہر طوفان میں مکہ پوری دنیا میں امن وسکون کا مرکز رہا ہے۔ علاوہ ازیں بے آب گیاہ وادی میں واقع ہونے کے باوجود دنیا کا ہر پھل اور ہر چیز مکہ کے بازاروں میں ہمیشہ وافر مقدار میں مہیا رہی ہے۔ معاشی واقتصادی بحرانوں کے باوجود مکہ کی منڈی میں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کی گئی۔ اور اب تو مکہ (بلکہ پورا عالم عرب) دنیا بھر میں سب سے زیادہ خوشحال فارغ البال خطہ بن گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی ناخلف اولاد جو ظالموں اور منکروں کی صف میں کھڑی ہے آج اسرائیل میں اپنے سرپرستوں کی مدد سے یہ کوشش کر رہی ہے کہ اس شہر امن وسکون کا تاریخی امن غارت کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ان لوگوں کی ناپاک سازشیں آئے روز منظر عام پر آتی رہتی ہیں چند سال قبل قبلہ اوّل بیت المقدس پر صیہونی قبضہ اور پھر اس عظیم المرتبت شہر میں آتش زنی انہی سازشوں کا حصہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کی سازشوں کو ملیا میٹ کر دے اور حرمین کو حسب سابق قیامت تک کے لیے خطہ امن و راحت بنائے۔ آمین

حضور نبی کریم علیہ السلام نے مکہ سے ہجرت کی اور مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے اس شہر کے بارے میں وہی دعا فرمائی جو ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے بارے میں کی تھی۔ مکہ اور مدینہ دونوں حرمین کہلاتے ہیں۔ یعنی جہاں خون ریزی بالکل حرام ہے۔ ہر دو

جلیل المرتبت انبیاء اللہ کی دعاؤں کا اثر آج بھی ان شہروں میں جاکر دیکھا جاسکتا ہے اور تاریخ کے سینے میں چھپے ہوئے واقعات بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

(۳)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ٥ (البقرہ، آیت ۱۲۷)

"اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے، تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

یہ دعا حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ اور ان کے جلیل القدر فرزند حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی زبان سے ادا ہوئی۔ یہ دعا دونوں باپ بیٹوں نے اس وقت مانگی جبکہ وہ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ یہ خدمت خدا کے حکم سے ہی سرانجام دے رہے تھے اور خلوص و وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ بیٹا بھاری پتھر اٹھا اٹھا کر لاتا اور باپ ان پتھروں کو اپنے ہاتھ مبارک سے دیواروں میں چنتا جاتا تھا۔ اللہ! اللہ! کیسا ایمان افروز منظر تھا۔ اللہ کے دو پیغمبر اللہ کے گھر کی تعمیر میں مزدوروں کی طرح مصروف تھے اور مزدوری رضائے الٰہی کا حصول طے پائی تھی۔ اس عظیم خدمت کی ادائیگی کے موقع پر بھی عظیم باپ اپنے صالح بیٹے کے ساتھ مل کر بارگاہِ ربانی میں عجز و انکسار کی تصویر بنے پکار رہا ہے۔ "اے ہمارے پروردگار تو ہر چیز سے واقف اور ہر چیز کو دیکھنے والا ہے ہماری یہ خدمت بھی اسی وقت کسی کام آسکے گی جب اسے تیری سرکار سے شرفِ قبولیت بخشا جائے۔

اللہ کے بندوں کی یہ لازمی صفت ہوتی ہے کہ وہ کسی بڑے سے بڑے نیک کام پر اتراتے نہیں ہیں بلکہ اپنے رب کے سامنے عجز و نیاز کے ساتھ ہاتھ پھیلائے کھڑے رہتے ہیں۔ اسوۂ ابراہیمی تمام ملتِ ابراہیمی کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ جب بھی کسی بھلائی کے لیے کمربستہ ہوں اور نیک کام کا بیڑا اٹھائیں تو اس کی قبولیت کے لیے رب ذوالجلال کی رحمت کو آواز دیں۔ اصل چیز تو دربارِ عالی کی منظوری ہی ہے۔

اپنی دُعا کا آغاز حمد ربانی اور درود وصلوٰۃ سے کرنا طریقۂ مسنونہ ہے اور دعا کو ختم کرنے کے لیے بھی درود وسلام ضروری ہے۔ آخری درود سے پہلے اور تمام دُعاؤں کے بعد مندرجہ بالا دُعا پڑھنا بہت مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے اندر یہ جامعیت ہے کہ جملہ ادعیہ کی منظوری وقبولیت کی درخواست اس کے اندر پائی جاتی ہے اور نہ صرف ادعیہ بلکہ ہر عملِ نیک کی قبولیت کی استدعا بھی اس میں شامل ہے۔

(۴)

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ج اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

(البقرہ، آیت ۱۲۸)

"اے رب ہم دونوں کو اپنا مطیعِ فرمان بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا، جو تیری مطیعِ فرمان ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

یہ بھی حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی دعا ہے۔ انہوں نے اپنے لیے بھی مسلم بنائے جانے کی دعا کی اور اپنی اولاد کے لیے بھی۔ مسلم وہ ہے جو خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کردے۔ اس کے ہر حکم کو بلا چون وچرا مانے اور کلیتہً اپنی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں دیدے۔ اپنی پسند وناپسند ختم کرکے راضی برضائے الٰہی ہو اور اس کی ہدایت سے ہٹ کر کبھی قدم نہ اٹھائے۔ زندگی میں بلاشبہ ایسے بے شمار مواقع انسان پر آتے ہیں کہ اس کا قدم راہِ اسلام سے ڈگمگانے کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے۔ بندۂ مسلم ایسے خطرناک لمحات کے ڈر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ ڈھونڈھتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے اس کمزور بندے کو ہر لمحہ "مسلم" کا رول ادا کرنے کی توفیق بخشے۔ حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ رتبۂ نبوت پر فائز ہونے کے باوجود اپنے لیے یہی دعا کیا کرتے تھے۔ اسی طرح جو دعا وہ

اپنی ذات کے لیے مانگا کرتے تھے وہی اپنی اولاد کے لیے بھی مانگتے کہ اولاد کے والدین پر بڑے حقوق ہیں اور ان حقوق میں سے نیک دعائیں بھی ایک بڑا حق ہے۔

عبادت کے طریقے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بتائے ہیں۔ ان مخصوص طریقوں کو چھوڑ کر کسی بھی دوسرے طریق پر عبادت کی جائے تو مردود ہے پھر یہ اہتمام عبادت بذات خود اس بات کی ضمانت نہیں کہ بندے کا کھاتہ صاف اور حساب بے باق ہو گیا بلکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی اور اس کی رحمت کی طلب لازمی چیز ہے۔ اس کے بغیر محض عبادت کے بل بوتے پر کوئی بھی شخص نجات حاصل نہیں کر سکتا، جیسا کہ صحیح حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ یہاں اس دعا میں عبادت کے طریقوں کی وضاحت بھی طلب کی گئی ہے اور پھر اس کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ سے معافی و درگزر کی استدعا بھی کی گئی ہے۔

چونکہ دعا کرنے والے دو ہی تھے اس لیے "مُسْلِمَیْنِ" (تثنیہ کا صیغہ) استعمال ہوا ہے۔ ہمیں دعا کرتے وقت مُسْلِمِیْن (صیغہ جمع) استعمال کرنا چاہیئے۔

⑤

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ ءَايَٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (البقرہ، آیت ۱۲۹)

"اے ہمارے رب، ان لوگوں میں خود انھیں میں سے ایک ایسا رسول اٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔"

حضرت ابراہیمؑ نے مکہ معظمہ میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مستقل طور پر آباد کر دیا تھا اور مکہ میں خانہ کعبہ کی تعمیر بھی کر دی تھی۔ علاوہ ازیں انہوں نے اس شہر کے

باشندوں کی بھلائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کی تھی کہ اس شہر کو پُرامن شہر بنا دے اور اس کے باسیوں کو ہر قسم کے میووں سے رزق بہم پہنچا۔ یہ دعائیں اہلِ مکہ کی جسمانی و دنیوی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اب حضرت ابراہیمؑ ان کی روحانی واخروی حاجات کے لیے بارگاہ ربانی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولا تو ان میں سے اپنا پیغمبر بھیجیو جو انہیں گمراہی میں بھٹکنے سے بچائے اور تیری راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ اس دعا میں بھی حضرت اسماعیل اپنے والدِ محترم کے ساتھ شریک ہیں۔

حضرت ابراہیم کو جدالانبیاء کہا جاتا ہے۔ آپ کی نسل میں بے شمار پیغمبر پیدا ہوئے۔ یہ پیغمبر بنو اسرائیل اور بنو اسماعیل دونوں شاخوں میں پیدا ہوئے۔ بنو اسرائیل آپ کے فرزند حضرت اسحاق کی اولاد ہیں اور ان کے بیٹے اسرائیل (یعقوبؑ) کی نسبت سے بنی اسرائیل کہلاتے ہیں۔ اس شاخ کے پیغمبروں کی تعداد ان گنت ہے۔ حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اسی شاخِ معطر کے گلہائے سرسبز ہیں۔

دوسری شاخ بنو اسماعیل ہے۔ اس شاخ میں صرف دو پیغمبر مبعوث ہوئے۔ ایک حضرت اسماعیل ہیں جو اس دعا میں بنفسِ نفیس شریک تھے اور دوسرے خاتم الانبیاء سید الاولین والآخرین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ اس پورے سلسلہ میں کوئی اور نبی نہیں پیدا ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی دعا کا نتیجہ کئی صدیوں بعد مکہ میں برآمد ہوا جب کہ دنیا میں اللہ کے دین کو غالب کرنے والے پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے ان کے جدِ امجد نے خصوصی دعا کی تھی۔ ان کے علاوہ کسی بھی پیغمبر کے لیے خصوصی دعا نہیں کی گئی۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر آپ کی بعثت کی جانب اشارہ کرتے اس دعا کے الفاظ دھرائے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۂ البقرہ آیت ۱۵۱۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۶۴۔ سورۂ توبہ آیت ۱۲۸۔ سورۂ الجمعہ آیت ۲۔

(۶)

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ (البقرہ، آیت: ۲۰۱)

اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔

اسلام نے دین اور دنیا میں تفریق نہیں کی ہے۔ دنیا کے بعض نظامہائے زندگی ایسے ہیں جو دنیا سے بالکل منہ موڑ کر رہبانیت اور یوگ کی طرف انسان کو لے جاتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ جو انسان کو اس کی حیثیت اشرف المخلوقات سے گرا کر مکمل طور پر "دنیا کا کُتّا" بنا دیتے ہیں۔ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اس میں "دنیا" شجر ممنوعہ نہیں ہے نہ ہی "عقبیٰ" سے بے نیازی اس کے ہاں منظور ہے۔ یہاں دنیا کی زندگی میں بھرپور حصہ لے کر اخروی زندگی کی کامیابی حاصل کرنا مقصود ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تو تعلیم ہی یہ دی تھی کہ "الدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ" (دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔) یہاں جو کچھ بھی کسی نے بویا آخرت میں اسے وہی کچھ کاٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ جب اس سے دعا مانگتے ہیں تو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ان کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ زور آخرت کی بھلائی پر ہے کیونکہ حصولِ حسنہ کی دعا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی کرنے کے بعد آگ کے عذاب سے بچانے پر زور دیا گیا ہے۔

اس سے پہلے البقرہ آیت ۲۰۰ میں بیان کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا مطمح نظر محض دنیوی زندگی تک محدود ہوتا ہے۔ یہ کم ہمت و کوتاہ نظر مانگتے بھی ہیں تو بس دنیا کی بھلائی اور چند روزہ آسائش۔ ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

مذکورہ بالا دعائے مومنین نقل کرنے کے بعد آیت ۲۰۲ میں مژدہ سنایا گیا کہ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق دونوں جگہ (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) حِصّہ پائیں گے۔

⑦

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ ۝ (البقرہ، آیت - ۲۵۰)

"اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔"

یہ دعا بنی اسرائیل کے لشکر نے اس وقت مانگی تھی جب وہ اپنے سالار طالوت کی سرکردگی میں دریا عبور کر کے فلسطینی فوج کے مقابلے پر جا کھڑے ہوئے۔ یہ واقعہ حضرت سموئیل نبی کے زمانے میں پیش آیا۔ حضرت سموئیل نبی اسرائیل کے نبی اور بادشاہ تھے۔ ان کا زمانہ خلافت تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح تک بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے زمانہ میں بنی اسرائیل کی قدیم حریف قوم بنو عمالقہ نے کافی زور پکڑ لیا تھا۔ فلسطین کے اکثر علاقے بنو عمالقہ نے بنی اسرائیل سے چھین لیے تھے۔ حضرت سموئیل بہت ضعیف العمر ہو چکے تھے۔ بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ ان کی قیادت کے لیے کسی تنومند نوجوان کو مقرر کیا جائے جس کی کمان میں وہ اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں۔ حضرت سموئیل نے ان کے مزاج کو سمجھتے ہوئے بھانپ لیا تھا کہ وہ نئے لیڈر کے لیے شور تو مچا رہے ہیں لیکن جب اس کا اعلان ہو گا تو یہ لوگ اپنی عادت کے مطابق حرف نکتہ چینیاں کرنے لگیں گے نیز نیا لیڈر جب اعلانِ جہاد کرے گا تو یہ اپنی تاریخی بزدلی کا اعادہ کرتے ہوئے جہاد سے پہلو تہی کریں گے اور قسم قسم کے عذر ہائے لنگ پیش کرنے لگیں گے۔ اس وجہ سے حضرت سموئیل انہیں سمجھاتے رہے کہ وہ اس مطالبے سے دست بردار ہو جائیں مگر بنی اسرائیل نہ مانے۔

حضرت سموئیل نے بنی اسرائیل کے مسلسل اصرار پر خدا کے حکم سے حضرت طالوت کو قوم کا بادشاہ بنایا۔ طالوت کے بارے میں یہ متحقق نہیں کہ آیا وہ نبی بھی تھے یا محض بادشاہ۔ بائیبل میں ان کا نام ساؤل ہے اور قرآن میں طالوت۔

طالوت قبیلہ بن یمین سے تھے۔ جب انہیں قائد بنایا گیا تو ان کی عمر تیس سال تھی۔

وہ نہایت خوبصورت مضبوط اور بلند قامت تھے۔ عام لوگ ان کے کندھوں تک پہنچتے تھے۔ طالوت کو حضرت سموئیلؑ نے اپنے گھر لا کر سر پر تیل انڈیلا، ان کو چوما اور کہا "خداوند نے تجھے مسح کیا تاکہ تو اس کی میراث کا پیشوا ہو۔" اس کے بعد بنی اسرائیل کے اجتماعِ عام میں حضرت سموئیل نے اس ہونہار جوان کی بادشاہی کا اعلان کیا۔

بنی اسرائیل میں چار افراد کو مسح کیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت ہارون علیہ السلام، دوسرے طالوت، تیسرے حضرت داؤد علیہ السلام اور چوتھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام (استفادہ از تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۸۵ تا ۱۸۸)

یہ طالوت بنی اسرائیل کا لشکر لے کر دریائے اردن کے پار بنو عمالقہ کے مقابلے پر گیا۔ مقابلہ جالوت سے تھا۔ جالوت کے لشکر کی ہیبت بنی اسرائیل پر پہلے ہی چھائی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں اس سے قبل کئی معرکوں میں بنی اسرائیل اسی لشکر سے شکست بھی کھا چکے تھے اس لیے کئی لوگوں نے تو میدان کارزار میں اترنے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ "لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ" (آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے۔) جہاں یہ کم ہمت لوگ یہ عذر پیش کر رہے تھے وہیں بعض عالی ہمت جواں عزم مجاہدین یہ بھی کہتے ہوئے سنائی دیئے۔ "كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ" (بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے)

یہی مجاہدین صف شکن تھے کہ جو جان ہتھیلی پر رکھے دشمن کے مقابلے پر جا ڈٹے اور اپنی تمام کوشش اور ظاہری سامان میدان میں ڈھیر کر دینے کے بعد وہ بارگاہِ اقدس میں دست بستہ دعا کر رہے تھے کہ ہمارے پروردگار ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جما دے اور ہمیں ان کافروں کے مقابلے پر فتح سے ہمکنار کر۔

اللہ کے بندوں کا کام یہی ہے کہ وہ معرکہ حق و باطل میں جانے سے قبل اپنی مقدور بھر مادی تیاری اور ظاہری ذرائع و وسائل کو بھرپور انداز سے کام میں لاتے ہیں اور اس کے بعد پھر اللہ کی نصرتِ غیبی کے لیے پکارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا تو وعدہ یہی ہے کہ وہ اپنی راہ میں جہاد کرنیوالوں کی مدد کرتا ہے اور کامیابی کے راستے انہیں سجھاتا ہے "وَالَّذِينَ جَاهَدُوا

فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط" (العنکبوت، آیت: ۶۹)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اصحاب طالوت کی طرح جب اپنے ۳۱۳ جان نثار و جاں سپار مجاہدین خدا کے سامنے میدانِ بدر میں لاکر پیش کر دیئے تو اس کے بعد رات کی تنہائی میں فتح و نصرت کی دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کی بھی مدد کی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فتح مبین سے نوازا! اور یہ اللہ کی سنت ہے کہ جب بھی اس کے بندے اپنی مکمل تیاری کے بعد اس کے دین کے غلبے کی خاطر باطل قوتوں کے مقابلے پر نکلیں گے اور اس سے مدد مانگیں گے تو وہ ان کی مدد کرے گا۔

لشکر طالوت نے جب یہ دعا مانگی تو سامنے جالوت کھڑا دعوتِ مبارزت دے رہا تھا۔ وہ بہت شہ زور اور گراں ڈیل پہلوان تھا۔ کسی کو اس کے مقابلے پر جانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ بالآخر حضرت داؤد جن کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی، غیرتِ ایمانی سے تمتما اٹھے، اس کے مقابلے پر گئے اور اسے تہہ تیغ کر دیا۔ جالوت قتل ہوا اور اس کے لشکر کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام پوری قوم کے ہیرو بن گئے۔ آگے چل کر بنی اسرائیل کی نبوت و بادشاہت انہی کے حصے میں آئی۔

۸

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ○

(البقرہ، آیت: ۲۸۵)

"ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک! ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے یہاں مومنین کی یہ دعا نقل فرمائی ہے، اس سے پہلے اسی آیت میں اسلام کے بنیادی عقائد کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے "اللہ کا رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے ربّ کی طرف سے اس پر نازل کی گئی۔ رسول کی اطاعت میں مومنین نے بھی اس

ہدایت کو بدل و جان تسلیم کرلیا ہے۔ یہ لوگ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔" ان چار چیزوں کے ساتھ اپنی دعاؤں میں وہ ایمان بالآخرت کی تصدیق بھی کرتے ہیں جبکہ وہ کہتے ہیں "الیک المصیر" گویا اسلام کے پانچ بنیادی عقائد کا تذکرہ یہاں کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بے شمار نعمتیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں۔ ان نعمتوں میں سے سب سے اعلیٰ و ارفع نعمت اسلام کے لیے انسان کے سینے کو کھول دینا ہے جس انسان پر اسلام کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اس سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں۔ یہ نعمت مل جانے کے بعد انسان کا صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ وہ خدا کے ہر حکم پر عملاً مسلمان ہونے کا ثبوت مہیا کرے۔ نیز اس نعمت کو پا لینے کے بعد انسان یہ ہرگز نہ سمجھے کہ میں نے اپنی عقل رسا سے یہ مرتبہ حاصل کیا ہے۔ انسان کو سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان سے اسے یہ توفیق بخشی ہے کہ اسلام کو اس نے قبول کر لیا ہے۔ اب اللہ کا ہر حکم اس کے لیے بسر و چشم ہے اور کہیں بھی اس کے لیے یہ گنجائش نہیں کہ وہ ان احکام کو اپنے عقلی فلسفوں کے ذریعے جانچنے لگے کہ آیا یہ قرینِ مصلحت ہے یا نہیں۔ اس کا کام اب صرف "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے ہر وقت اللہ سے عفو و درگزر طلب کرتے رہنا چاہیے کیونکہ اسی کے ہاں سب کو جانا ہے جہاں کہ وہ تمام باتوں کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔

۹

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۖ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ (البقرہ، آیت ۲۸۶)

"(ایمان لانیوالو! تم یوں دعا کیا کرو) اے ہمارے پروردگار! ہم سے بھول چوک

میں جو قصور ہو جائیں ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے وہ ہم پر نہ ڈال۔ ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔

سورۂ بقرہ مدنی ہے لیکن اس کی آخری آیات مکّی دور میں نازل ہوئی تھیں۔ ان کا زمانہ نزول ہجرت سے ایک سال پہلے بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس وقت نازل ہوئی تھیں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج نصیب ہوئی۔ اس وقت سرزمینِ مکہ اہلِ حق کے لیے ایک بھٹّی بن چکی تھی۔ مشکلات و مصائب کے پہاڑ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ مظالم کی خونچکاں داستانیں جو اس دور کی یادگار ہیں، آج بھی دل دہلا دیتی ہیں۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کی توجہ ہر وقت اس بات کی طرف لگی رہتی تھی کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کب نصرت آتی ہے۔ حدیث شریف میں حضرت خباب بن ارت صحابی کا واقعہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔[1]

اس دعا میں بھی بڑی حکمت کے ساتھ بیرونی مصائب اور آزمائشوں کا ذکر کرنے سے قبل اندرونی لغزشوں اور ذاتی خطاؤں کا تذکرہ اور ان پر معافی مانگی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزمائشوں کے طوفان بعض اوقات اہلِ حق کے پائے استقامت میں ضعف پیدا کر دیتے ہیں مگر بیرونی آزمائشوں سے زیادہ خطرناک انسان کی اندرونی کمزوریاں اور باطنی خامیاں ہوتی ہیں۔ بیرونی عوامل کا تو مقابلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے لیکن اندرونی امراض گھن کی طرح کھا جاتے ہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے ہر لمحہ خطا و لغزش صادر ہونے کا امکان رہتا ہے۔ یہ بلا ارادہ اور غیر شعوری کوتاہیاں بعض اوقات

---

[1] جب اہلِ حق پر ایسا کربناک دورِ ابتلا وارد ہوا تو ان کے مالک نے انہیں راہ دکھائی۔ اپنی طرف سے یہ دعا ان کو سکھا دی کہ تمہارے لیے ان مشکلات کے مقابلے پر یہ ذکر و مناجات ایک ڈھال ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے یہ الفاظ دل کی مضبوطی، حوصلے کی بلندی اور استقامت کی پختگی کے لیے نسخہ کیمیا کا درجہ رکھتے ہیں۔

کبائر تک لے جاتی ہیں اگر ان پر بروقت تنبیہ نہ ہو جائے اور اس کی تلافی کا سامان نہ کیا جائے۔ پھر ان کوتاہیوں پر اگر حق تعالیٰ کی جانب سے فوراً مواخذہ کیا جانے لگے تو یہ کمزور انسان چند لمحوں کے لیے بھی دھرتی پر چلتا ہوا نظر نہ آئے۔

اس دعا میں سکھایا گیا ہے کہ پہلے اپنی لغزشوں پر معافی مانگو، پھر اللہ تعالیٰ سے درخواست کرو کہ وہ پہلے لوگوں کی طرح تم پر بوجھ نہ ڈالے۔ جب یہ دعا نازل ہوئی تھی اس وقت اس دعا کے حاصل کرنیوالے اگرچہ بڑی تکلیف دہ حالت میں جادۂ حق کی منازل طے کر رہے تھے مگر ان سے پہلے لوگوں نے تو اس سے بھی زیادہ شدید حالات کا سامنا کیا تھا۔ ان کو آرے سے چیرا گیا، ان کے گوشت لوہے کی کنگھیوں سے نوچے گئے، انہیں زندہ آگ میں پھینکا گیا اور ان کو زمین میں گاڑا گیا۔ اہلِ اسلام کو یہ سکھایا گیا کہ تم دعا مانگو کہ اللہ تعالیٰ تم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالے۔ آج بھی اہلِ حق کے لیے آزمائشیں موجود ہیں مگر ابتدائی دور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کا ابتلا نہایت کٹھن تھا۔ آج بندۂ مومن دعا کرتا ہے تو اس میں تمام اہلِ اسلام جو اس سے قبل گزرے ہیں "مِنْ قَبْلِنَا" میں شامل ہیں۔

انسان کے اندر مصائب برداشت کرنے کی ایک قوت قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اس قوت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد تک انسان مشکلات برداشت کرتا چلا جاتا ہے مگر اس حد سے آگے اس کی قوتِ برداشت جواب دے جاتی ہے (اگرچہ اکثر بزدل لوگ اس قوتِ برداشت کی حد سے بھی بہت پہلے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور بعض جری انسان اس حد بندی کے بھی قائل نہیں ہوتے اور رخصت کے بجائے عزیمت ہی ان کا شیوہ و مسلک ہوتا ہے۔ یہ جان دے کر ایمان بچانے والے لوگ ہوتے ہیں) اس دعا میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم اپنے مولا سے عرض کرو۔ وہ تمہاری طاقت سے زیادہ بوجھ تم پر نہ لادے۔ مسلم قانت کو کبھی دل میں آزمائش کی تمنا نہ کرنی چاہیے بلکہ ہر لمحے اس سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے تاہم جب آزمائش آجائے تو پھر یہ دعا کرنی چاہیے کہ خداوند عالم ثابت قدمی کی دولت بخشے۔ ثابت قدمی کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزمائش کو اللہ تعالیٰ قوتِ برداشت کے تابع کر دے۔ یہاں یہی دعا سکھائی گئی ہے۔

دعا کے آخر میں پھر عفو و درگزر اور رحم کی درخواست ہے کہ اگر اس ذات کا عفو اور رحم بندے کے شاملِ حال نہ ہو تو بندہ کس قابل ہے۔ بندہ اس کی مدد کے بغیر نہ تو اندرونی بیماریوں سے بچ سکتا ہے نہ بیرونی حملوں کی تاب لا سکتا ہے۔ دعا کو ختم ان الفاظ پر کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کافروں کے مقابلے پر مومنین کی مدد فرمائے۔ کفر اور اسلام کی جنگ میں مومنین کا سہارا اور توکل اللہ کی ذات ہوتی ہے اور کافروں کا اعتماد و بھروسہ اپنی مادی قوت اور عددی اکثریت پر ہوتا ہے۔ مومنین اپنے مالک سے مدد مانگتے ہیں اور وہ مدد کرنے والا حالات کو بدلنے پر آتا ہے تو پل جھپکنے کی دیر نہیں لگتی۔

۱۰

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ○ (آل عمران، آیت: ۸)

”اے پروردگار ہمارے! جب تو نے ہمیں سیدھے راستے پر لگا دیا ہے تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دینا۔ ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔“

یہ دعا سورۂ آل عمران کے آغاز میں منقول ہوئی ہے۔ سورہ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ قرآن مجید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی نے نازل کیا ہے۔ اس قرآن مجید میں دو طرح کی آیات نازل کی گئی ہیں۔ ایک محکمات اور دوسری متشابہات، محکمات وہ آیات ہیں جن کی زبان بالکل صاف اور مفہوم متعین ہے۔ ان میں کسی قسم کے شکوک و شبہات کی گنجائش نہیں اور نہ ہی تاویلات کے ذریعے ان کے معانی میں تحریف کی کوئی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے۔ اصولیات و احکام انہی محکم آیات میں بیان کیے گئے ہیں۔ متشابہات وہ آیات ہیں جن میں احکام و عقائد تو بیان نہیں کیے گئے لیکن مابعد الطبیعیات کی حقیقت سے انسان کو روشناس کرانے کے لیے ایک تصور الفاظ کے ذریعے اس کے سامنے پیش کر دیا

گیا ہے۔ ان آیات کو متشابہات کا نام اسی وجہ سے دیا گیا ہے کہ ان کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہو سکتی ہے اور جتنا زیادہ کھوج اور کرید کی جائیگی اتنا ہی اشتباہ بڑھتا جائے گا اور گمراہی کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔ چونکہ نجاتِ اخروی اور حیاتِ دنیوی کا دارومدار محکمات پر ہے اس لیے مومنین کا کام یہی ہے کہ وہ متشابہات سے صرف کسی چیز کا تصور (خواہ وہ دھندلا سا تصور ہی کیوں نہ ہو) اخذ کرلیں اور اپنی توجہ محکمات پر مرکوز کریں۔

جن لوگوں کے دل میں کجی ہوتی ہے ان کی ساری دوڑ دھوپ اور تحقیق و جستجو متشابہات پر ہوتی ہے کیونکہ ان کے خبثِ باطنی کو یہیں کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ ان لوگوں کے برعکس علم میں پختہ اور خدا سے ترساں بندوں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام آیات کو اللہ کی جانب سے نازل شدہ نعمت سمجھتے ہیں اور اپنا زور محکمات پر عمل کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ خدا تعالیٰ کے سامنے مذکورہ بالا دعا پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر کی تشریح سے معلوم ہو گیا ہے یہ دعا اہلِ علم مومنین خدا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے علم کی پختگی اور حزم و احتیاط کی شدت کے باوجود "زیغِ قلوب" کے فتنے سے ڈرتے رہتے ہیں۔ انہیں ہدایت کی جو دولت مل جاتی ہے اس پر وہ مغرور نہیں ہوتے بلکہ خائف رہتے ہیں کہ کہیں اس دولت سے محروم نہ ہو جائیں۔

اس دعا کی حقیقت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب انسان تاریخ کا مطالعہ کرے۔ دنیا میں ایسے بے شمار لوگ گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں کہ جو ہدایت پانے کے بعد دل کی کجی میں مبتلا ہو کر ہدایت کھو بیٹھے۔ ان لوگوں کا سرخیل ابلیس ہے کہ جس نے خدا کے دربار میں اپنی عبادت گزاری کی وجہ سے بلند رتبہ حاصل کر لیا تھا مگر اس کے عجب نے اسے زندانِ لعنت میں پابندِ سلاسل کر دیا۔ یہ بڑی عجیب بات اور تلخ حقیقت ہے کہ کئی ایسے لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی دولت سے مالا مال کیا ہوتا ہے اور جن کی دعوت و کوشش سے بے شمار غافل و بے خبر لوگ ہدایت پاتے ہیں آخر ایک دن وہ داعیانِ ہدایت خود گمراہی و ضلالت کے غاروں میں جا گرتے ہیں۔ ان کی دعوت و تبلیغ سے اس مقام پر آنے والے ششدر رہ جاتے ہیں کہ ان کو اس محفل میں لانے والے

کہاں گم ہو گئے۔

انسان جب گم کردہ راہ لوگوں کو دیکھتا ہے تو بسا اوقات اسے دکھ ہوتا ہے اور بھٹکے ہوئے راہیوں سے جذبۂ ہمدردی پیدا ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ان کی حالت دیکھ کر ہنس دیتا ہے اور خود کو بڑا تیس مار خاں سمجھتا ہے کہ اس نے ہدایت کا دامن تھام رکھا ہے، یہ مقام نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ شیطان کے حملوں میں سب سے کارگر حملہ یہی ہوتا ہے کہ وہ انسان کو یہ سمجھا دے کہ "تو بڑا کچھ ہے۔" ایک بندہ مؤمن کی صفت جیسا کہ اس دعا سے پہلے اور اس دعا میں بیان کی گئی ہے یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ یہ درخواست کرتا ہے کہ اس مبدأ فیض نے اسے ہدایت کی توفیق بخشی ہے تو اب اس ہدایت پر اسے ثابت قدمی بخشے، اس کے دل و دماغ کو ہر قسم کی ٹیڑھ سے محفوظ رکھے اور اپنی رحمت اس کے شامل حال کر دے۔ آخر اس کے فضل و انعام کے بغیر کون ہے جو سیدھی راہ قائم رہ سکے۔

(۱۰)

رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

(آل عمران، آیت: ۱۶)

"اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمارے گناہ معاف فرما اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچا لے۔"

یہ دعا کرنے والے اہلِ جنت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک وہ لوگ جو دنیا اور اس کی متاع کے بندے بن کر زندگی گزارتے ہیں دوسرے وہ لوگ جو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کر کے پوری ذمہ داری سے وظائفِ حیات ادا کرتے ہیں۔ یہ دوسرے لوگ نہایت خوش قسمت ہیں۔ ان کے لیے ان کے پروردگار نے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان کو جنت میں پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور

انہیں اللہ کی رضا بھی حاصل ہو گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے ہیں جو میری راہ میں تمام مشکلات اٹھاتے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں، ہر معاملے میں راست باز ہیں، میرے فرماں بردار ہیں، سخاوت کرتے ہیں اور رات کے آخری حصہ اٹھ کر مجھ سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ یہی میرے بندے ہیں کہ جو مجھ سے یہ دعا مانگتے ہیں "یا اللہ ہم ایمان لائے ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے امن میں رکھ۔"

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی صفات بھی بیان کی ہیں اور ان کا اجر بھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی دلی آرزو کو دعا کے رنگ میں بیان فرما دیا ہے۔ ان کی صفات میں ہمیں ایمان اور اس کے تقاضوں کے مطابق ثابت قدمی و پاک سیرتی نظر آتی ہے۔ ان کے اجر میں جنات و ازواج مطہرات اور رضوان الٰہی کا تذکرہ ہے اور ان کی دعا میں ایمان کا اظہار کرنے کے بعد گناہوں سے معافی کی درخواست اور دوزخ کی آگ سے نجات کی عرضداشت شامل ہے۔

ہم مومن ہیں اور یہ دعا ہم مانگتے رہتے ہیں۔ اس دعا کی قبولیت کے لیے ضروری ہے کہ ہم وہ کردار پیدا کریں جو اس دعا کے مانگنے والوں کی صفت کے طور پر دعا سے پہلے اور بعد میں بیان ہوا ہے یعنی تقویٰ۔ ایمان کے بعد ثابت قدمی، راستبازی، فرماں برداریٔ خدا، انفاق فی سبیل اللہ اور شب بیداری۔ یہ صفات اگر ہمارے اندر پیدا ہو جائیں اور پھر ہم اپنے مالک کے سامنے دست بستہ یہ دعا مانگیں تو اس سے امید ہے کہ ہماری دعا قبول فرمائے گا اور ہمیں اپنے انعامات سے نوازے گا۔ اے اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم تیری ہی رضا کے طلبگار بن جائیں!

۱۲

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ

تَشَآءُ ۭ بِیَدِكَ الْخَیْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○

(آل عمران، آیت: ۲۶)

تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ۡ وَتُخْرِجُ
الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ ۡ وَتَرْزُقُ
مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ○ (آل عمران، آیت: ۲۷)

" کہو! خدایا! ملک کے مالک!

تو جسے چاہے، حکومت دے اور جس سے چاہے، چھین لے۔ جسے چاہے، عزت بخشے اور جس کو چاہے، ذلیل کردے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔ جانداروں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو۔ اور جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔"

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سکھائی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب مدینہ منورہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جان نثار ساتھیوں پر سخت تنگی کا وقت تھا اور ان کے مقابلے میں دشمنانِ اسلام دنیوی لحاظ سے بہت خوشحال تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں کو یہ دعائیہ کلمات سکھائے اور ان کے نزول کے کچھ ہی عرصہ بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ فاقہ کشوں اور خاک نشینوں کو تاج و تخت اور مال و دولت کی فراوانی عطا کردی گئی۔ طاقتور اور بزعمِ خویش ناقابلِ شکست قوتیں ذلیل و خوار ہوگئیں اور ان کا زور ایسا ٹوٹا کہ پھر ان کا نام و نشان باقی نہ رہا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض نماز کے بعد یہ دعائیہ کلمات پڑھا کرتے تھے اور صحابہ کرام کو بھی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ وہ فرض نماز کے بعد ان کا ورد کیا کریں۔

---

(۱۳)

رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ج اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ (آل عمران، آیت : ۳۵)

"اے میرے پروردگار جو بچہ میرے پیٹ میں ہے وہ تیری نذر کرتی ہوں کہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہے۔ میری اس قربانی کو قبول فرما۔ تو سننے اور جاننے والا ہے۔"

یہ دعا حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ماجدہ نے مانگی تھی۔ حضرت مریم ابھی بطن مادر میں تھیں جب ان کی والدہ نے نذر مانی کہ جو بچہ ان کے ہاں پیدا ہونے والا ہے اسے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے وقف کر دے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے ہاں اولادِ نرینہ ہوگی اور وہ بچہ زندگی بھر خدا کی راہ میں مصروفِ جہاد و محوِ عبودیت رہ کر اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے باعث رحمت و فلاح ثابت ہوگا۔ بنی اسرائیل میں اس طرح کی نذریں لوگ مانا کرتے تھے۔ جب بچے کی پیدائش ہوئی تو والدہ پریشان ہو گئیں، کہ لڑکے کے بجائے لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ لڑکا ان پابندیوں سے مستثنیٰ ہوتا ہے جو لڑکی کے لیے لازمی ہیں۔ پھر لڑکی بے چاری کی کئی کمزوریاں اور مجبوریاں بھی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ دین کا کام باہر جا کر نہیں کر سکتی۔

یہ پریشان کن صورت حال ایک طرف اور ایفائے نذر کا فریضہ دوسری طرف۔ حضرت مریم کی والدہ نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی نذر ضرور پوری کریں گی۔ انہوں نے پھر اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○" یعنی (اے مالک) میں نے اپنی اس بچی کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان کے تمام فتنوں سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے امِ مریم کی دعا سن لی اور ان کی نذر کو بخوشی قبول فرما لیا۔ حضرت زکریا نبی جو اس وقت بنی اسرائیل کے ہادی و پیشوا تھے اور حضرت مریم کے رشتہ میں خالو تھے حضرت مریم کی کفالت کے لیے چنے گئے۔ حضرت مریم عبادت گاہ کے ساتھ ایک حجرے میں سکونت پذیر

ہو گئیں اور حضرت زکریا ان کی تربیت و پرداخت پر خصوصی ذوق و شوق سے متوجہ رہے۔ اس دوران میں حضرت مریم کی کئی کرامات حضرت زکریا علیہ السلام کے سامنے آئیں۔ ان کا کچھ تذکرہ اگلی دعا میں آتا ہے۔

بچوں کو دین کے کاموں اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف کر دینا ایک بہت بڑی نیکی ہے۔ آج خدا کے دین کی حالت جتنی کمزور ہے شاید اتنی کبھی نہ تھی۔ دین کے دشمنوں نے بین الاقوامی سطح پر دین کی بنیادیں ڈھا دینے کی سازشیں تیار کر رکھی ہیں۔ دین کی مظلومیت یہاں تک شدت اختیار کر گئی ہے کہ دین اب اپنے گھر میں بھی اجنبی ہی نہیں بلکہ قابل نفرت چیز بنا دیا گیا ہے۔ ایسے حالات میں دین کا درد رکھنے والے اکثر و بیشتر زبانی جمع خرچ تک ہی اپنی تگ و دو محدود رکھتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کارنامہ سرانجام دیا تو یہ کہ خود کبھی کبھار فرصت کے لمحات میں دین کی خاطر کوئی معمولی سی قربانی دے دی لیکن اپنی اولاد کو اس طرف لگا دینے والے اور اس عظیم القدر مقصد کے لیے اسے وقف کر دینے والے شاذونادر ہی مل سکتے ہیں! اولاد کے بارے میں ان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے عہدے اور مناسب سنبھالیں، بڑے سے بڑا کاروبار سیٹ کریں اور سرمایہ کمائیں تاکہ ان کی زندگی آرام سے گزرے۔ معلوم نہیں یہ دشمنی لاشعوری طور پر اپنی اولاد کے ساتھ روا رکھی جاتی ہے یا جان بوجھ کر انہیں جواہرات کی کان سے دور رکھ کر خزف ریزوں سے کھیلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ زندگی آرام سے گزارنا اچھی بات ہے لیکن یہ طے کر لینا چاہیے کہ "زندگی" بذات خود کیا ہے؟ اس کے کتنے حصے ہیں اور ہر حصے کی خصوصیات کیا ہیں؟ یہ چند روزہ زندگی بھی آرام سے ہی گزرے تو اچھا ہے لیکن اصل زندگی (حیات بعد الموت) کو فراموش کر کے اس زندگی کا آرام کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس زندگی کا کیا حال ہے کانٹوں پر بھی گزر جائے تو پرواہ نہیں کیونکہ اس کی مہلت اس زندگی کے دوام کے مقابلے میں اتنی بھی تو نہیں جتنا ایک قطرہ سمندر کے مقابلے پر ہوتا ہے۔

آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ام مریم کے جذبہ کو زندہ کیا جائے۔ دین کا درد رکھنے والے اپنی اولاد کو دین کے غلبہ کے لیے وقف کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دعائے

امِ مریم کی طرح ان کی دعائیں شرفِ قبولیت سے محروم رہیں۔

(۱۴)

رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ○

(آل عمران، آیت : ۳۸)

"اے میرے مالک، اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر۔ تو ہی دُعا سننے والا ہے"

یہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا ہے۔ حضرت زکریا نبی اسرائیل کے پیغمبر اور بیت المقدس کے متولی و منتظم تھے حضرت مریم آپ کی کفالت میں ہی پلی تھیں حضرت مریم بیت المقدس کی عبادت گاہ کے ساتھ ایک الگ تھلگ حجرے میں رہتی تھیں حضرت زکریا جب کبھی باہر جاتے تو حجرہ بند کر جاتے۔ وہ جب واپس آتے تو حضرت مریم کے پاس انواع و اقسام کے پھل اور کھانے موجود پاتے۔ اکثر پھل بے موسم اور غیر علاقوں کے بھی ہوتے ہوں گے جنھیں دیکھ کر حضرت زکریا یہ سوال کرتے "يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا" (اے مریم یہ سب کچھ تیرے پاس کہاں سے آیا؟) تو وہ جواب دیتیں "هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○" (یہ سب کچھ اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے دیتا ہے)

حضرت مریم کے پاس قسم قسم کے کھانے اور میوے دیکھنے نیز ان کا من جانب اللہ ہونا سن کر حضرت زکریا کے دل میں خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ وہ انہیں اولاد عطا فرما دے۔ حضرت زکریا اس وقت تک بے اولاد تھے اور بڑھاپے کی وجہ سے بظاہر اب اولاد کی کوئی توقع بھی نہ تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی زوجہ محترمہ بانجھ تھیں لیکن انہوں نے حضرتِ حق سے دعا مانگی کہ وہ انہیں اولادِ نیک عطا کرے۔ ان کی یہ دعا قبول ہوئی۔ وہ محرابِ اقدس میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ فرشتے نے انہیں نیک بچے کی بشارت دی۔ بڑھاپے میں بانجھ عورت سے بچہ پیدا ہونا خرقِ عادت تھا اس لیے حضرت زکریا نے حضرت

زکریا نے تعجب سے کہا "پروردگار! میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ پھر کیوں کر ہمارے ہاں بچہ پیدا ہوگا؟" تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "میں جو کچھ چاہتا ہوں کر دکھاتا ہوں۔ میرے لیے کیا مشکل ہے۔"

حضرت زکریا علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسا فرزند بخشا جسے نبوت و قیادت سے سرفراز کیا گیا۔ حضرت یحییٰ کا نام خود اللہ تعالیٰ نے رکھا تھا جیسا کہ سورہ مریم کے آغاز میں مذکور ہے۔ ان سے قبل یحییٰ نام کا کوئی شخص نہیں گزرا۔

اس دعا میں طلب اولاد کی حقیقت و علت واضح کر دی گئی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت زکریا نے حضرت مریم کو دیکھا کہ وہ چھوٹی سی عمر میں خدا کی عبادت میں مصروف رہتی ہیں اور خدا کے انعامات کا یہ عالم کہ جنت سے ان کے لیے میوہ جات بھیجے جا رہے ہیں تو دل میں خیال آیا کہ ایسی نیک اولاد تو ایک نعمت ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ جب دعا کی تو اس میں زور اس بات پر دیا کہ اولاد نیک عطا ہو۔ اولاد کی طلب اگرچہ ایک فطری داعیہ ہے لیکن اہلِ ایمان کے لیے اولاد کی نیکی و صالحیت، تقویٰ و للہیت اور پاکیزگی و عفت زیادہ اہم چیز ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کو نیکی کی بات کرنی چاہیے یا پھر خاموش رہنا چاہیے[1]۔ گویا کہ نیکی کی بات کرنا خاموشی سے اچھا ہے اور برائی کی بات کرنے سے خاموشی بہتر ہے۔ اسی طرح اللہ کی طرف سے نیک اولاد کا ملنا بے اولاد ہونے سے بدرجہا بہتر ہے اور بُری اولاد سے بے اولاد ہونا ہی اچھا ہے۔ مومن کو اولاد کی خواہش کے ساتھ اولاد کی نیک سیرتی و پاک طینتی کی بھی تمنا اور دعا کرنی چاہیے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے جس طرح یہ دعا کی اسی طرح ہر مومن و مسلم کو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہنا چاہیے۔ بے اولاد لوگوں کے لیے یہ بڑا مجرب نسخہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے نہایت خلوص کے ساتھ ہر نماز کے بعد یہ دعا مانگیں اور دل میں یہ خواہش رکھیں کہ ان کی اولاد دین کی خدمت کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر اس دعا کی قبولیت میں اس انسان کا بھلا ہوگا، تو یہ دعا قبول کرے گا۔

---

[1] مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فَلْیَقُلْ مَعْرُوْفًا اَوْ لِیَصْمُتْ۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (آل عمران، آیت: ۵۳)

"اے ہمارے مالک جو فرمان تو نے نازل کیا ہے ہم نے اسے مان لیا اور رسول کی پیروی کی پس ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔"

یہ دعا حواریانِ عیسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ حضرت عیسیٰ نے جب بنی اسرائیل میں پیغامِ حق لوگوں کو سنایا اور کلامِ الٰہی پیش کرنے کے علاوہ کوئی معجزات بھی ان کو دکھلائے تو اس ہٹ دھرم قوم نے بجائے ایمان لانے کے انکار کا راستہ اختیار کیا۔ حضرت عیسیٰ نے جب ان کے تیور دیکھے اور انہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اصحابِ اقتدار انکارِ حق پر بالکل آمادہ ہیں تو انہوں نے پکار کر کہا "مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ" (کون راہِ خدا میں میرا دست و بازو بنے گا) تو حواریان نے جواب میں کہا۔ "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ" (ہم اس راہ میں آپ کے مددگار بنیں گے) ساری قوم کی مخالفانہ روش اور اس کے معاملے میں ان پاکیزہ سیرت لوگوں کا نعرۂ مستانہ خطرات سے خالی نہیں تھا۔ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حواریانِ عیسیٰ معاشی و معاشرتی لحاظ سے کمزور لوگ تھے اور ان کے مقابلے پر قوم کا طاقتور عنصر حق کی مخالفت پر کمربستہ تھا۔ اب ان لوگوں نے پورے شعور کے ساتھ ایک بارِ عظیم اٹھانے کا عہد کیا تھا حضرت عیسیٰ کے ساتھ مل کر دعوتِ حق لوگوں تک پہنچانا کوئی معمولی اور آسان کام نہ تھا۔ یہ نہایت کٹھن اور جان جوکھوں کا کام تھا حضرت عیسیٰ کو اپنی مکمل حمایت و وفاداری کا یقین دلانے کے بعد وہ اپنے رب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ مولائے کریم ہم نے تیری ہدایت کو تسلیم کر لیا ہے اور تیرے نبی کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ اب تو ہمیں ان لوگوں کی فہرست میں لکھ لے جو تیرے دربار میں جا کر دعوتِ حق پھیلانے کے گواہ بن کر کھڑے ہوں گے۔

دعوتِ حق کو قبول کر لینا ایک بڑی خوش بختی ہے لیکن اصل معراج یہ ہے کہ اس دعوت کو قبول کرنے کے بعد اسے آگے پھیلانے کا کام سنبھالا جائے۔ جو لوگ دعوتِ حق

گو مان کر اس پر ذاتی حد تک عمل پیرا ہو جاتے ہیں وہ بھی مطیع فرمان تو ہیں لیکن جو حق کے پروانے اس دعوت کی اشاعت و تبلیغ اور اس پیغام کے غلبہ و تمکین کے لیے دن رات بھاگ دوڑ میں لگے رہتے ہیں وہ ایسے مومن ہیں جو پیغمبروں کے سچے جانشین ہیں۔ قیامت کے روز دربارِ الٰہی میں جب تمام جن و انس فیصلہ سننے کے لیے جمع ہوں گے تو وہاں انبیائے کرام لوگوں کے حق میں یا ان کے خلاف گواہی دینے کے لیے کھڑے ہوں گے۔ مومن و اعیانِ حق جن کی زندگی کا مقصد ہی اقامتِ دین رہا تھا وہ بھی اس منصب سے نوازے جائیں گے کہ گواہی دیں۔ ان کی گواہی کا مقبول ہونا ان کی رفعتِ شان کی دلیل ہے۔

حواریانِ عیسٰی کی مذکورہ بالا دعا مومنین کے لیے بڑا قیمتی تحفہ ہے۔ پہلے وہ اقرارِ ایمان کرتے ہیں پھر رسول کی ہر معاملے میں بے چون و چراں اطاعت کا اعلان کرتے ہیں اور اس کے بعد اپنے آپ کو شہدائے حق میں لکھے جانے کی درخواست خدا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

حضرت عیسٰی کی دعا ان کے حواریوں نے سن لی تھی اور اپنی کمزوری کے باوجود حمایتِ حق کا پُرجوش اعلان کر دیا تھا۔ آج اسلام بھی ہمیں پکار رہا ہے۔ ”مَنْ اَنصَارِی اِلَی اللّٰہ“ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے کچھ بندوں نے اس آواز کو سن لیا ہے اور وہ جواب میں ”نحن انصار اللّٰہ“ کا عملی نمونہ بن کر کھڑے ہیں۔ جہاں ان افراد کی دنیا میں موجودگی باعثِ مسرت و موجبِ خیر ہے وہاں بحیثیت مجموعی امتِ مسلمہ کی غفلت و بے تعلقی قابلِ افسوس و وجہِ ندامت ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنے والے ہر شخص کی یہ شان ہونی چاہیئے کہ یہ کلمہ اسے پکارے تو وہ لبیک کہتا ہوا دوڑ پڑے۔ اے اللہ آج ہمیں صدق ابوبکر و عدل فاروق کی ضرورت ہے۔ ہم سخاوتِ عثمانی و شجاعتِ حیدری کے محتاج ہیں۔ ہمیں روحِ بلالی و استقامتِ عماری کی ضرورت ہے۔ تو ہمیں ان صفات سے نواز۔ پھر ہم اقبالؒ کے اشعار کی تصویر بن جائیں

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

---

(۱۶)

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ○ (آل عمران، آیت: ۱۴۷)

"اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

یہ دعا ان خدا پرستوں کی ہے جنہوں نے اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ مل کر راہِ خدا میں جہاد کیا اور اس راہ میں آنے والی مصیبتوں سے پست ہمتی اور کمزوری کے بجائے انہوں نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ باطل کے سامنے جھک جانا ان کی سرشت کے خلاف تھا ان لوگوں کو قرآن "رِبِّیُّوْنَ" کے نام سے یاد کرتا ہے جس کا مفہوم ہے "اللہ والے"۔ قرآن مجید بتاتا ہے کہ شدائد کے مقابلے میں ان لوگوں کی حالت یہ ہوتی تھی کہ وہ فولاد بن جاتے اور ان کی زبانوں پر یہ دعا جاری ہوتی جو اوپر درج کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں جس مقام پر یہ دعا منقول ہے اس کی شانِ نزول سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۲۱ سے لیکر ۱۸۰ تک پورا ایک خطبہ ہے جو جنگِ احد کے حالات پر نہایت جچا تلا تبصرہ ہے۔ اس خطبہ میں سے اکثر آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب احد کی فتح شکست میں تبدیل ہونے کے بعد مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ مدینہ جا رہے تھے۔ کچھ آیات ایک سال بعد نازل ہوئیں اور حضور اکرم کے حکم سے پہلی نازل شدہ آیات کے ساتھ ہی لکھ دی گئیں۔ (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۳۰۲ حاشیہ ۱۲۳)

یہ دعا آیت ۱۴۷ میں مذکور رہے۔ اس سے پہلے بتایا گیا ہے کہ میدانِ احد میں مسلمانوں کو زخم کھانے پڑے اور وہ (منافقین کی چالبازیوں سے متاثر ہو کر) دل ہار بیٹھے۔ پھر جب یہ خبر پھیل گئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو منافقین نے شور مچایا کہ اگر وہ اللہ کے نبی ہوتے تو کیسے قتل ہوتے، کچھ منافقین نے یہ کہا کہ دین کا بانی تو مارا گیا (نعوذ باللہ) جلو اب

اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ چلیں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ محمدؐ تو اللہ کے رسول ہیں، ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں۔ اگر ان کی دنیا سے رحلت ہو جائے یا انہیں شہید کر دیا جائے تو کیا تم دین کو چھوڑ جاؤ گے؟ اگر چھوڑ جاؤ گے تو دین کا اور اللہ تعالیٰ کا کیا بگاڑ لو گے۔ اس حماقت سے نقصان ہوگا تو تمہارا اپنا ہی ہوگا۔

مومنین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو جان لو کہ موت نہ وقتِ مقررہ سے پہلے آسکتی ہے نہ اس وقتِ مقررہ سے ٹالی جا سکتی ہے۔ باقی اللہ سے اگر کوئی دنیا کی طلب کرتا ہے تو اللہ اسے دنیا دے دیتا ہے اور اگر کسی کو آخرت کی طلب اور خواہش ہوتی ہے تو آخرت میں اس کے لیے جزائے خیر اور رضائے الٰہی مقدر ہو جاتی ہے۔ تم میدان میں زخم کھانے کے بعد ہمت ہار کر بیٹھ گئے حالانکہ مومنین کا یہ کام نہیں ہے[1] مومنین کی تو شان ہی نرالی ہے۔ اللہ کے کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں کہ جنہوں نے خدا کی راہ میں باطل نظام اور طاغوتی طاقتوں سے ٹکر لی پھر ان نبیوں کے ساتھیوں نے مشکلات کے موقع پر باطل کے سامنے سپر نہیں ڈالی بلکہ ثابت قدمی سے ڈٹے رہے۔ اس وقت ان ثابت قدم خدا پرستوں کی دعا یہ ہوتی تھی کہ اے مالک ہمیں ان مشکلات سے تو کوئی خوف نہیں ہے۔ ہمیں ڈر تو اس بات کا ہے کہ ہمارے گناہ نہ ہمیں لے ڈوبیں اور ہمیں اپنے مقابلے پر دشمنوں کی قوت و کثرت خوفزدہ نہیں کر سکتی۔ ہم خوفزدہ ہیں تو اس بات سے کہ کہیں ہماری طرف سے تیری حدود سے تجاوز نہ ہو جائے۔ پس ہماری گذارش یہی ہے کہ ہمارے گناہوں کی معافی دی جائے۔ ہماری طرف سے تجاوزِ حدود سے صرفِ نظر کیا جائے، دشمنوں کے مقابلے پر ہمیں ثابت قدمی بخشی جائے اور کافروں پر ہمیں غلبہ نصیب ہو۔

---

[1] حضورؐ کی شہادت کی افواہ سن کر کئی صحابہ کرام کے دلوں پر ایسا صدمہ ہوا کہ وہ سوچنے لگے حضورؐ کے بعد اب جنگ سے کیا فائدہ؟ لیکن بہرحال ایسے صحابہ بھی تھے جنہوں نے کہا حضورؐ کے بعد اب زندگی کا کیا مزہ۔ آؤ اور حضورؐ کے نقشِ قدم پر چل کر جامِ شہادت نوش کر لو۔ یہ مخلص الایمان لوگ تو اپنی اپنی سوچ کے مطابق نیک نیتی سے یہ رائے قائم کر رہے تھے مگر منافقین ازراہِ شرارت و دشمنیٔ اسلام مختلف قسم کی حرکاتِ شنیعہ میں مصروف تھے

ان اللہ والوں کے بارے میں قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا و آخرت دونوں جگہ بہترین اجر سے نوازا اور اللہ کو ایسے ہی نیک اعمال کرنے والے لوگ محبوب ہیں ۔

مومنین کو ہر وقت اپنے گناہوں کی معافی خدا سے مانگتے رہنا چاہیے اور اللہ کی حدود سے باوجود کوشش کے کوئی نہ کوئی تجاوز ہو ہی جاتا ہے اس کی معافی بھی طلب کرتے رہنا لازمی ہے۔ پھر مشکلات کے مقابلے پر ثابت قدمی لازمۂ ایمان ہے اور یہ ثابت قدمی بجز رحمتِ خداوندی کیسے مل سکتی ہے ؟ اس کی طلب بھی خدا سے ہر وقت کرتے رہنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ کافروں کے مقابلے پر غلبہ حاصل کرنا مقصودِ حیاتِ مومنین ہے اور یہ غلبہ بھی تائید و نصرتِ ربانی کا مرہونِ منت ہے لہٰذا غلبۂ اسلام کی دعا بھی اس سے مانگتے رہنا چاہیئے ۔

۱۷

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (اٰل عمران، آیت : ۱۹۱)

" پروردگار! یہ (ساری کائنات اور اس کے عجائبات) تو نے فضول اور بے مقصد تو نہیں بنائے۔ تیری ذات اس سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے۔ پس! اے مالک ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے ۔ "

یہ دعا ان ہوشمند اور دانا و بینا لوگوں کی ہے جو کائنات کو بصیرت کی آنکھ سے دیکھتے اور عبرت حاصل کرنے کے لیے پرکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اندھے بن کر اس دنیا میں نہیں رہتے کہ کھانے پینے کے علاوہ انہیں کسی چیز سے کوئی غرض نہ ہو نہ یہ غافل لوگوں کی طرح ہوتے ہیں جو سرسری نظر سے اپنے گرد و نواح میں دیکھ لیتے ہیں اور ذہن سے سوچنے کا کوئی تصور ان کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ انہیں تو " اولی الالباب " یعنی ہوشمند لوگ کہا گیا ہے اور ان کی صفت یہ ہے کہ " آسمان و زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں " وہ جب

پوری دنیا چشم بینا اور ذہن پر فکر سے دیکھتے اور جانچتے ہیں تو انہیں یہ کائنات حکمتوں اور دانائیوں سے پر نظر آتی ہے۔ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کارخانۂ قدرت بغیر کسی ناظم و کارساز کے نہیں چل رہا بلکہ اس کی تنظیم کسی زبردست قوت کے ہاتھ میں ہے جو نہایت عقل و حکمت کے ساتھ اسے لگے بندھے اصولوں کے مطابق چلا رہی ہے۔

یہ لوگ محض چشم بینا اور فکرِ رسا ہی نہیں رکھتے بلکہ انہیں خداوند تعالیٰ نے قلب مصفیٰ بھی دیا ہوتا ہے اس لیے وہ اس کارخانۂ دنیا میں غور و فکر کرنے کے بعد اس کے خالق پر ایمان لے آتے ہیں اور بیٹھتے اٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے اسے یاد کرتے رہتے ہیں پھر یہ کارخانۂ قدرت اور اس کا مطالعہ انہیں بتاتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہوگی جہاں حساب کتاب ہوگا۔ اس زندگی کے امتحان سے یہ لوگ خائف رہتے ہیں اور خالقِ ارض و سما سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ ہستیٔ باری تعالیٰ کا پتہ اور اس کی ہدایات پر ایمان لانا ایسے امور ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے مبہم نہیں رہنے دیا بلکہ اپنے انبیاء کی وساطت سے واضح الفاظ اور صاف انداز میں لوگوں کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ ان امور کے لیے بنیادی ماخذ مطالعۂ کائنات اور مشاہدۂ ہستی نہیں ہے لیکن یہ چیز (مطالعہ و مشاہدہ) ان امور کی تصدیق کرتی ہے تکذیب نہیں۔ اس سے وحیٔ الٰہی کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کے ذریعے انسان اور اس کی حیثیت کو متعین کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ تاہم اس کے لیے کچھ لازمی شرائط ہیں جن میں ہوشمندی، غور و فکر اور ذہن و نظر کی پاکیزگی بہت اہم ہیں۔ ان شرائط کی موجودگی بلا شبہ وہ نتائج پیدا کر سکتی ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ ان شرائط کا نہ ہونا اس کے برعکس نتائج بھی سامنے لا سکتا ہے۔ یہی ایک مسلمان فلسفی اور کافر فلسفی کے درمیان فرق ہے اور یہی ایک مومن سائنسدان اور ملحد سائنسدان میں حدِ امتیاز ہے۔

مومن کا کام تو یہ ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے سے صداقت کی آواز سنے اور ہر گل بوٹے میں مشاہدۂ حق کرے۔ وہ دیکھے کہ یہ پھیلی ہوئی زمین اور اس کی دولتیں، چمکتا ہوا سورج اور اس کے منافع، بہتے ہوئے دریا اور ان کی آبادکاریاں، مہکتے ہوئے

باغ اور ان کی بہاریں، نیلگوں چادرِ فلک اور اس کی پہنائیاں، ٹھاٹھیں مارتے سمندر اور ان کی گہرائیاں، بلند و بالا کوہسار اور ان کے خزانے، روشنی بکھیرتا ہوا چاند اور اس کی رونقیں، جھلملاتے ہوئے تارے اور ان کی کہکشائیں، گھنے جنگلات اور ان کی مخلوقات، تپتے ہوئے صحرا اور ان کی وسعتیں، مختلف النوع حیوانات اور ان کی خصلتیں اور سب سے بڑھ کر یہ بندۂ خاکی اور اس کی صلاحیتیں۔ ان میں سے ایک ایک چیز اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ یہ کائنات عبث اور فضول نہیں، یہ با مقصد و با سبب ہے۔ یہ بے لگام و بے ربط نہیں یہ منظم و منضبط ہے۔ یہ بے خدا نہیں با خدا ہے۔ مومن جب اس کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو پکار اٹھتا ہے۔

"رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○"

(۱۸)

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ○

"پروردگار! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ پس اے ہمارے آقا، جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔"

یہ دعا بھی اہلِ حق ہی کی ہے۔ اہلِ بصیرت جس طرح ہر چیز کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں اسی طرح جب وہ کوئی بات سنتے ہیں تو اس کا بھی بنظرِ دقیق جائزہ لیتے ہیں اور سچی بات قبول کرنے میں انہیں کوئی باک نہیں ہوتا۔ پیغمبرِ حق کا پیغام ایمان باللہ کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور وہ پکار کر کہتا ہے کہ اپنے رب کو مانو۔ اس کے جواب میں نیک فطرت اہلِ نظر بول اٹھتے ہیں "ہم ایمان لائے اپنے رب پر" اس اقرارِ ایمان کے بعد وہ اللہ تعالیٰ

سے دعا کرتے ہیں کہ ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں، ان کی کوتاہیاں ان سے دور کر دی جائیں اور ان کا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کیا جائے۔

⑲

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝ (آل عمران ۱۹۴)

"خدایا، تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔"

یہ دعا بھی پہلی دونوں دعاؤں کے ساتھ کی ایک کڑی ہے۔ یہ تینوں دعائیں مسلسل چل رہی ہیں جو اہلِ ہوش و خرد مومنین کی زبانی بارگاہِ ربّانی میں پیش کی جا رہی ہیں۔ اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ مومنین سے وہ وعدے پورے کرے جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے مومنین سے کر رکھے تھے۔ ان وعدوں میں دنیا و آخرت میں اہلِ ایمان کی مدد و نصرت شامل تھی۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ (المومن آیت: ۵۱) "یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ (روزِ قیامت) اور وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (الروم آیت ۴۷)

"اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنین کی مدد کریں۔"

اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں تمہارے کسی بھی عمل کو ضائع نہیں کروں گا۔ جس نے میری خاطر قربانیاں دیں اور مصائب جھیلے اس کا اجر میرے ذمے ہے۔ میں ان کے قصور معاف کر دوں گا اور انہیں جنت میں داخل کروں گا۔ باقی رہا اہلِ کفر کا معاملہ تو ان کی مادی خوشحالی سے کسی بھی مومن کو فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ چند دنوں کے لیے ان کی رسی دراز

کی گئی ہے، اس کے بعد ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

(۲۰)

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَاۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّاۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۞

(النساء، آیت: ۷۵)

"اے خدا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔"

یہ دعا ان کمزور مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی ہے جو ہجرت کے بعد مکہ یا گردو نواح کے قبائل میں رہ گئے تھے۔ یہ مظلومین اسلام قبول کر چکے تھے لیکن نہ تو ان کے پاس اتنی قوت تھی کہ دشمنوں سے مقابلہ کر سکیں اور نہ ہی ان کے پاس ایسے ذرائع و وسائل تھے کہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ جائیں۔ اہل مکہ اور دیگر کفار قبائل کسی مسلمان کو مدینہ جانے کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔ صحابہ کرام کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین نے بڑی مشکلات کے بعد ہجرت کی منزل طے کی۔ کفار سمجھتے تھے کہ ان لوگوں کا ہمارے ہاتھوں سے نکل کر مدینہ جا پہنچنا اسلامی ریاست کی تقویت کا باعث بن سکتا ہے۔ صلح حدیبیہ ۶ھ کے موقع پر بھی سفیر مکہ سہیل بن عمرو نے بڑے زور کے ساتھ یہ شرط معاہدہ میں درج کرائی تھی کہ اگر کوئی شخص مکہ میں مسلمان ہو جائے تو اسے مدینہ جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ سہیل کا اپنا بیٹا ابو جندلؓ جو مکہ کی جیل سے بھاگ آیا تھا اور مدینہ جانے کا متمنی تھا اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہہ کر واپس بھیج دیا کہ معاہدہ کی رو سے یہ ناممکن تھا۔ بعد میں حضرت ابو جندل اور حضرت ابو بصیر نے مکہ و مدینہ کے درمیان ایک پہاڑی پر ڈیرہ جما لیا اور اہل مکہ کے تجارتی قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا تو قریش نے خود یہ شرط ختم کرنے کی درخواست کی اور یوں ابو جندل اور ان کے ساتھیوں کے لیے مدینہ کا راستہ کھلا۔

یہ واقعات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قریش مکہ کی ذہنیت سمجھ میں آجائے۔ وہ اہلِ اسلام کو تختۂ مشق ستم بنا کر خوشی محسوس کرتے تھے اور مدینہ کی جانب کسی مسلمان کا ہجرت کرنا ناممکن بنا دیا گیا تھا۔ ان حالات میں وہ مسلمان جو اس ظلم کی چکی میں پس رہے تھے ان کے عزم کا یہ حال تھا کہ اپنے ایمان پر ثابت قدم تھے اور اس کی حفاظت کے لیے ہر امتحان سے گزرنے کا ولولہ ان کے سینوں میں موجزن تھا۔ اس کے باوجود آخر وہ انسان ہی تھے اور مشکلات برداشت کرتے کرتے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنے مولا سے یہ دعا کیا کرتے تھے کہ "مالک اس بستی سے جس کے رہنے والے ظالم و ستم شعار ہیں ہمیں نکال لے اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی مضبوط حامی و مددگار بھیج۔" ان کمزور لوگوں کی یہ دعا جس مقام پر نقل ہوئی ہے وہ ایسی آیات ہیں جن کا زمانۂ نزول غزوۂ احد کے بعد کا ہے۔

غزوۂ احد کے بعد قریش مکہ کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے اور مسلمان کچھ مضمحل تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں جھنجھوڑا اور کہا کہ تمہاری کمزوری کی کوئی وجہ نہیں ہے "اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ"
(سورہ نساء آیت: ۱۰۴) (اگر تم نے میدان احد میں زخم کھائے ہیں تو تم سے پہلے میدانِ بدر میں تمہارا دشمن بھی زخم کھا چکا ہے۔ پھر تمہارے درمیان اور ان کے درمیان واضح فرق یہ ہے کہ تمہیں اللہ کے ہاں سے وہ کچھ ملنے والا ہے جس کی تمہارے دشمن کو کوئی توقع نہیں۔)

(۲۱)

رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○ (المائدہ، آیت: ۲۵)

"اے میرے ربّ، میرے اختیار میں میری اپنی ذات اور میرے بھائی کے علاوہ کوئی نہیں پس تو ہمیں ان نافرمانوں سے الگ کر دے۔"

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے۔ اس دعا کا مفہوم سمجھنے کے لیے ان حالات کا سمجھنا ضروری ہے جن میں یہ دعا مانگی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکلے اور ارضِ موعودہ کی جانب سفر شروع کیا تو راستہ میں دشتِ فاران پہنچ کر آپ نے پڑاؤ ڈالا۔ آپ کو حکم ہو چکا تھا کہ ارضِ فلسطین کو فتح کر کے اپنی میراث حاصل کریں۔ آپ نے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کی نسبت سے بارہ سردار منتخب کیے اور انہیں فلسطین کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیج دیا۔ یہ وفد فلسطین کے حالات دیکھنے کے بعد آیا اور قادس کے مقام پر اس نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ وفد کے دو ارکان نے پُرزور الفاظ میں سفارش کی کہ فلسطین پر حملہ کیا جائے اور اللہ کے توکل پر بھروسہ کر کے اسے فتح کر لیا جائے۔ اللہ کی رضا حاصل رہے تو اس ملک کا فتح کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ قرآن مجید نے ان پرجوش مجاہدوں کا تذکرہ کیا ہے مگر ان کے نام نہیں بتائے۔ توراۃ میں ان کے نام یوشع اور کالب مذکور ہیں۔ ان دو کے علاوہ وفد کے باقی ارکان نے یک زبان ہو کر کہا کہ حملہ نہ کیا جائے۔ ان کی رائے میں "فلسطین کے لوگ ہم سے زیادہ طاقتور ہیں۔ وہ قدآور اور جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں۔ ہم تو ان کے مقابلے پر بالکل ٹڈے معلوم ہوتے تھے۔" ان بزدلوں کی بات سن کر ساری قوم پکار اٹھی "اے کاش ہم مصر میں ہی مر جاتے۔ اے کاش ہم اسی بیابان میں مر جائیں......"

یوشع اور کالب کی تقریر کے جواب میں بعض ناہنجاروں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ان دونوں کو سنگسار کر دیا جائے۔ اس قوم نے جب اللہ کے نبی کے حکمِ جہاد پر یہ عملی مظاہرہ کیا اور بول کر کہہ دیا "اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ" (اے موسیٰ! جاؤ تم اور تمہارا رب دشمن سے لڑائی کرے ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں) تو ربّ العزت نے اپنے جلال میں آ کر فیصلہ سنا دیا کہ اچھا اگر ان کی یہ حالت ہے تو چالیس برس تک جنگلوں میں خاک چھانتے پھریں گے اور انہیں (سوائے یوشع اور کالب کے) فلسطین کی مٹی بھی نصیب نہ ہو گی۔

یہ صورت حال تھی جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے سامنے اپنی اور اپنے

بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی ذات کو پیش کر دیا اور عرض کیا "مولا ہم تو ہر حکم پر لبیک کہنے والے ہیں۔ باقی لوگوں کی سرکشی تو نے دیکھ لی۔ وہ ہمارے بس میں نہیں لہٰذا ان نافرمانوں سے ہمیں الگ کر دے۔" اس دعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان دو مسلم سرداروں (یوشع اور کالب) کا نام نہیں لیا حالانکہ انہوں نے بھی اپنے آپ کو جہاد کے لیے پیش کر دیا تھا۔ اس کی کئی وجوہات مفسرین نے بیان کی ہیں لیکن زیادہ دل کو یہ بات لگتی ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون دونوں اللہ کے نبی تھے اور انبیاء کا مقام امتیوں سے کافی بلند ہوتا ہے۔ حکم جہاد ہو گیا تھا تو اگر وہ ملتوی نہ ہوتا تو پیغمبرانِ حق تو جہاد پر روانہ ہو ہی جاتے خواہ کوئی اور جاتا یا نہ جاتا۔ تاہم حضرات یوشع اور کالب کے جذبہ صادق تو اللہ تعالےٰ نے شرفِ قبولیت بخشا اور سرزمین فلسطین کی فتح کا منظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس بزدل قوم کو بیابانوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ چالیس سال تک مارے مارے پھرتے رہے۔ جنگ سے منہ موڑنے والے تمام کے تمام لوگ مر گئے اور اس دعا کے وقت جن بچوں کی عمر بیس سال سے کم تھی وہی رہ گئے۔ اب حضرت موسیٰ اپنی فوج لے کر حملہ آور ہوئے۔ حضرت ہارون راستے میں انتقال فرما گئے۔ شرق اردن فتح کرنے کے بعد حضرت موسیٰ کا بھی انتقال ہو گیا اور یوشع بن نون کے عہدِ خلافت میں فلسطین کا پورا علاقہ فتح ہوا۔ یوشع اور کالب دونوں نے ارضِ مقدس کی فتح کے بعد وفات پائی۔

(۲۲)

رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ○ (المائدہ آیت: ۸۳)

"پروردگار، ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔"

اس دعا کو سمجھنے سے پہلے اس کے پس منظر سے آگاہی ضروری ہے۔

دعا سے پہلے کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ مومنین کے ساتھ یہود اور مشرکین

کا تعلق بدترین دشمنوں کا سا ہے اس کے برعکس وہ لوگ جو کہتے ہیں "انا نصاریٰ" وہ مومنین کے لیے اپنے دل میں محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔ آگے ان لوگوں کی کچھ مزید صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے سامنے جب قرآن مجید کی تلاوت کی گئی تو اس کے اثر سے ان پر رقتِ قلب کی کیفیت طاری ہو گئی اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ پکار اٹھے "رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ"۔

سید قطبؒ اپنی معرکۃ الآراء تفسیر فی ظلال القرآن جلد دوم صفحہ ۱۲ پر ان کی اس کیفیت قلبی کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "یہ کیفیت نفسِ انسانی کے لیے بالکل فطری امر ہے کیوں کہ جب اس کے پاس کسی جذبے کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں ہوتے تو وہ آنسوؤں کی زبان میں اس جذبے کو پیش کرتا ہے۔"

یہ دعا کرنے والے لوگ کون تھے؟ احادیث میں ان کا تذکرہ آیا ہے۔ امام نسائیؒ نے سنن نسائی میں حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی روایت نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ دعا نجاشی شاہِ حبشہ اور اس کے ساتھیوں کی ہے جو انہوں نے حضرت جعفر طیارؓ کی تقریر سن کر مانگی تھی۔ (اور قارئین کرام حضرت جعفرؓ کی تقریر کے واقعہ سے باخبر ہوں گے۔) دوسری روایت طبرانی نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے حوالے سے نقل کی ہے جس میں ان کا بیان ہے کہ یہ دعا حبشہ سے آنیوالے لوگوں کی ہے جنھوں نے حضرت جعفر طیارؓ کے ساتھ مدینہ منورہ میں حاضری دی تھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے قرآن مجید پڑھا۔ قرآن سُن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حضورِ اکرمؐ نے ان سے پوچھا "کیا تم اپنے ملک میں جا کر اپنے پرانے مذہب کی طرف پلٹ جاؤ گے؟" انہوں نے جواب دیا۔ "ہم اس دینِ حق سے کبھی روگردانی نہیں کریں گے۔" پھر انہوں نے یہ دعا مانگی اور اس کے ساتھ مزید کہا۔ "آخر ہم اللہ پر اور اس کی طرف سے جو کچھ پیغامِ صداقت ہم تک پہنچا ہے اس پر کیوں نہ ایمان لائیں۔ ہمیں تو اللہ سے اُمید ہے کہ وہ ہمیں اپنے صالح بندوں میں شامل کرے گا۔" (مائدہ، آیت: ۸۴)

یہ جماعت حبشہ کے کسانوں کی جماعت تھی۔ بہر حال بعید نہیں کہ نجاشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اور جماعتِ مومنین کے علاوہ بھی بے شمار لوگ اس آیت کے مصداق ہوں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آج نصاریٰ ہونے کے مدعی کیوں اسلام اور اہل اسلام کے قریب نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ جن نصاریٰ کے بارے میں قرب اہل ایمان و مودّتِ اسلام کی خبر دی گئی وہ زبانی دعویٰ کرنے والے لوگ نہ تھے بلکہ عملاً و فعلاً تعلیماتِ عیسوی پر کاربند تھے اور تعلیماتِ عیسوی میں تصدیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قبول اسلام ایک نہایت اہم اور بنیادی حکم تھا۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے اس کا جواب یہ دیا ہے۔ "جب اقربہم مودّۃ کی علّت ہی موجود نہیں تو معلول یعنی قرب مودّت کیوں کر موجود ہوگا۔" (المائدہ، حاشیہ ۲۱۴)

اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے اس نے جنّت مقدر کر دی ہے دائماً وہ اس میں رہیں گے اور یہی محسنین کا بدلہ ہے۔

(۲۳)

رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

(المائدہ، آیت: ۱۱۴)

"اے اللہ! ہمارے پروردگار، ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔"

یہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی دعا ہے۔ ان کے حواریوں نے ان پر ایمان لانے کے بعد ان سے ایک دن سوال کیا کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر دے۔ یہ سوال بنی اسرائیل پر دورِ موسوی میں نزولِ منّ و سلویٰ کے واقعات پڑھنے اور سننے کے بعد حواریوں نے پوچھا ہوگا۔ یہ سوال سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے کہا "اگر تم مومن ہو تو اللہ سے ڈرو۔ اس قسم کی باتوں میں نہ پڑو۔" حواریوں نے عرض کیا۔

"حضرت ہم یہ سوال کسی بدنیتی یا شرارت کی وجہ سے نہیں کر رہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس خوان میں سے ہم کھائیں، ہمارے دلوں کو اطمینان ملے، ہم یقین سے جان لیں کہ آپ نے ہم سے جو کچھ فرمایا وہ بالکل سچ ہے اور ہم اس پر گواہ رہیں۔"

حواریانِ عیسیٰ کا یہ سوال بھی اسی نوعیت کا ہے جس نوعیت کا سوال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا تھا۔ "ربِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتیٰ" (پروردگار مجھے دکھا دو کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کریں گے۔) اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا تھا۔ "اَوَلَمْ تُؤْمِنْ؟" (کیا تو میری اس قدرت کو مانتا نہیں؟) تو حضرت ابراہیم نے عرض کیا۔ "بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ" (کیوں نہیں میرے مالک! میں تیری قدرت کو مانتا ہوں لیکن صرف اطمینانِ قلب کے لیے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔) پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں مشاہدہ کرایا۔ (البقرہ، آیت: ۲۶۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور فریضۂ نبوت کی ادائیگی کے لیے انہیں پوری دنیا کے سامنے جانا تھا اس لیے وہ اطمینانِ قلب اور مشاہدۂ حقائق کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حواریانِ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی آنجناب کے ساتھ مل کر بنی اسرائیل کے سامنے پیغامِ حق پیش کرنا تھا اس لیے وہ بھی اطمینانِ قلب کی دولت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

حواریوں کی درخواست پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا مانگی۔ جب یہ دعا مانگی گئی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "میں یہ خوان نازل کر دیتا ہوں لیکن یہ سوچ لو کہ اس صریح نشانی کے بعد پھر تم میں سے جس نے کفر و انکار کیا تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا جو دنیا میں سے کسی کو بھی نہیں دیا جائے گا۔" یہ خوان بعد میں اتارا گیا یا نہیں؟ قرآن سے اس کی صراحت نہیں ہوتی مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن جلد اوّل میں سورہ المائدہ حاشیہ نمبر ۱۲۹ میں لکھتے ہیں:۔

> "ممکن ہے یہ نازل ہوا ہو اور ممکن ہے حواریوں نے بعد کی دھمکی سن کر اپنی درخواست واپس لے لی ہو۔"

یہ دعا علماء کے نزدیک نزولِ بارش کے لیے مانگی جاسکتی ہے۔ بارش بھی دراصل ایک خوان ہی ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اس کے نزول سے ہر کہ دمہ کے دل

میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے، اس حقیقت کو وہ لوگ بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جن کا ذریعۂ معاش کاشتکاری ہے اور جن کے علاقوں میں فصلوں کو سینچنے کے لیے سوائے بارش کے اور کوئی وسیلہ دستیاب نہیں ہے۔ وہ زمین میں بیج ڈالنے کے بعد اس خوانِ آسمانی کی طرف ہی دیکھتے رہتے ہیں اور جب یہ خوان قطراتِ آب کی صورت میں نازل ہوتا ہے تو انہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا رزق نازل ہو رہا ہے۔ اس موقع پر علاقہ بھر کے تمام باشندوں کے چہروں پر ایسی ہی خوشی اور دمک ہوتی ہے جیسے عید کی آمد آمد ہو۔

(۲۴)

اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ‌ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝ (المائدہ، آیت: ۱۱۸)

" (اے اللہ) اگر تو انہیں سزا دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر معاف کر دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔"

یہ اگرچہ باقاعدہ دعا کے الفاظ نہیں لیکن ان میں دعا کا مفہوم موجود ہے۔ یہ عرض داشت حضرت عیسٰی علیہ السلام قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے پوچھے گا کہ آیا انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ انہیں اور ان کی والدہ کو اللہ کے سوا معبود مانیں تو حضرت عیسٰی دو ٹوک الفاظ میں اس کی تردید کریں گے اور کہیں گے، "یا اللہ میں ناحق بات کیسے کہہ سکتا تھا۔ میں نے تو تیری ہی عبادت کی اور اس کی تلقین کی۔ جب تک میں ان کے درمیان رہا میں ان کا نگران تھا، جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ہی ان کے نگران تھے۔"

حضرت عیسٰی نہایت رحم دل اور شفیق پیغمبر تھے (اور اللہ کے تمام ہی پیغمبران صفات سے متصف ہوتے ہیں) قیامت کے دن جب ان کو گواہی کے لیے بلایا جائے گا اور وہ گواہی دے چکیں گے تو بارگاہِ ربانی میں یہ درخواست بھی پیش کر دیں گے کہ باری تعالیٰ یہ

لوگ ہیں تو تیرے عذاب کے مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے تیری نافرمانی کی لیکن بہر حال ہیں تیرے ہی بندے۔ تو عذاب دینا چاہے تو تجھے کوئی روک نہیں کرسکتا اور نہ ہی اسے بے انصافی کہا جا سکتا ہے اور اگر تو ان گناہ گار لوگوں کو معاف بھی کر دے تو تجھے کون چیلنج کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس دعا کے جواب میں فرمائے گا۔ " یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے ان کے لیے جنات ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔" گویا جھوٹوں کو اس دن کوئی چیز نفع نہ پہنچا سکے گی۔

(۲۵)

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا سکتہ وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (الاعراف آیت : ۲۳)

" اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

یہ دعا حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت مائی حوا نے مانگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی تخلیق کے موقع پر تمام فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ وہ آدم کی عظمت کا اعتراف کریں اور تعظیم سے اس کے سامنے جھک جائیں۔ فرشتوں کے ساتھ یہ حکم جنوں کو بھی دیا گیا۔ باقی تمام تو حکم بجالائے مگر ابلیس نے انکار کر دیا۔ وہ جنات میں سے تھا جیسا کہ سورۂ کہف میں بیان ہوا ہے۔ اس نے اس حکم عدولی کے جواز میں دربارِ الٰہی میں مختلف عذر پیش کیے جن میں ایک یہ بھی تھا۔ " أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ ○ " یعنی اے خدا میں اس کے سامنے جھک جاؤں حالانکہ مجھے تو نے آگ سے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے لہٰذا میں اس سے بہتر اور بلند درجہ ہوں۔

اس نافرمان کی یہ بات سن کر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے دربار سے نکل جانے کا حکم دیا۔ دربار سے نکلتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اس کا جو مکالمہ ہوا وہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر

نقل ہوا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورہ البقرہ آیت ۳۴ تا ۳۶ ۔ الاعراف آیت ۱۲ تا ۱۸ ۔ الحجر آیت ۲۹ تا ۴۴ ۔ بنی اسرائیل آیت ۶۱ تا ۶۵ ۔ ص ۷۵ تا ۸۵)

اس مکالمے میں شیطان نے کہا تھا کہ "اے اللہ اس آدم کی وجہ سے مجھے تو اپنے دربار سے ذلیل و خوار کر کے نکال رہا ہے لہٰذا میں اسے گمراہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گا۔" اللہ تعالیٰ نے اسی وقت فرمایا تھا کہ میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہ چلے گا۔ (اگر وہ بشری تقاضوں سے بھول کر کوئی غلطی کر بھی لیں گے تو فوراً ندامت کے آنسوؤں سے اپنے گناہوں کو دھونے کی فکر کریں گے اور میرے در پہ دستک دیں گے تو میں انہیں معاف بھی کر دوں گا۔)

ابلیس کے دربارِ ربانی سے اخراج کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تلقین کی کہ وہ اپنی بیوی کے ہمراہ جنت میں رہیں اور شیطان کے بہکاوے میں نہ آئیں ۔ شیطان آدم اور اولادِ آدم کا ازلی و ابدی دشمن ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ شیطان نے حضرت آدم اور حضرت حوّا کو بہکانے کی مسلسل کوشش کی اور اس میں بالآخر وہ کامیاب ہو گیا۔ اس کا طریق واردات ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ انسان کا خیر خواہ بن کر اور برائی کو اچھائی کے جھوٹے پردوں میں لپیٹ کر نمودار ہوتا ہے ۔ حضرت آدم و حوّا کے سامنے بھی وہ آیا تو اسی روپ میں۔ اس نے شجرِ ممنوعہ کے بارے میں بتایا کہ اس میں کوئی برائی یا اس کا پھل کھانے میں کوئی قباحت ہرگز نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے کھانے سے صرف اس لیے منع کیا ہے کہ تم کھا لو گے تو ہمیشہ یہیں رہو گے اور فرشتے بن جاؤ گے جن پر موت وارد نہیں ہو گی ۔ حضرت آدم اور حضرت حوّا نے شیطان کو نہ پہچانا اور غلطی سے ممنوعہ درخت کا پھل کھا لیا ۔ بس پھل کا چکھنا ہی تھا کہ ان کا ستر غائب ہو گیا ۔ جب یہ حالت نمودار ہوئی تو حضرت آدم و حوّا دونوں کو فوراً احساس ہو گیا کہ ان سے لغزش اور بھول صادر ہو گئی ہے ۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ فوراً اپنے خالق و آقا کے سامنے گڑگڑائے اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اپنی کوتاہی کی معافی طلب کی۔

اس دعا کا ایک ایک لفظ اس تاثر سے مملوّ ہے کہ دعا کرنے والے کو اپنے کیے پر قلبی

ندامت ہے۔ وہ یہ بھی بخوبی جانتا ہے کہ اس کا مقام نافرمانی نہیں بلکہ اطاعت و فرماں برداری ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ غلطی کی معافی دینے والی وہی ایک ہستی ہے جس کے سامنے وہ دست بستہ حاضر ہے۔ اس کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اگر دعا قبول نہ ہوئی تو پھر اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اس کے نزدیک اس در سے ٹھکرائے جانے کے بعد کوئی دوسرا در ہے ہی نہیں جہاں سے اس کی مراد بر آئے۔ اللہ کے مطیع و مسلم بندے کے یہی حقیقی تصویر اور شان ہوتی ہے کہ وہ غلطی ہو جانے پر بے چین و بے قرار ہو جاتا ہے۔ اسے کسی کل چین نہیں آتا جب تک کہ وہ اپنی غلطی کی معافی نہ حاصل کر لے۔

حضرت آدم و حوا کی اس دعا کو خداوند کریم نے قبول کر لیا۔ انہیں معاف کیا اور معافی دینے کے بعد انہیں زمین پر اتار دیا گیا کہ یہی منشائے تخلیق تھا۔ کہا گیا کہ اب تم اپنی اولاد کو بتاؤ کہ زمین پر ہمارے فرماں بردار بن کر رہیں گے تو دائمی طور پر جنت میں رہیں گے اور اگر سرکشی اختیار کریں گے تو ہمیشہ نارِ جہنم میں جلتے رہیں گے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی ایک روایت ابن کثیرؒ نے محدث عبدالرزاقؒ کے حوالے سے لکھی ہے جس میں وہ حضرت آدم اور اللہ تعالیٰ کے مکالمے کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو پھل کھاتے ہی یہ احساس ہو گیا کہ ان کے ستر کھل گئے ہیں۔ حضرت آدم دوڑ پڑے اور ایک درخت کے نیچے سے گزرے تو سر کے بال اس کی شاخوں میں اڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پکارا "آدم تو مجھ سے بھاگ جانا چاہتا ہے؟" جواب دیا۔ "نہیں میرے پروردگار میں تو شرم کے مارے چھپتا پھرتا ہوں۔" اللہ تعالیٰ نے پوچھا "کیا میں نے وہ پھل حرام نہیں کیا تھا جسے تو نے اپنے لیے مباح کر لیا۔" آپ نے عرض کیا۔ "مولا تیری عزت کی قسم میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی تیرے نام پر جھوٹا حلف بھی اٹھا سکتا ہے۔" (شیطان کی قسموں کی طرف اشارہ کیا۔ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِينَ)

اس کے بعد آپ کو خدا نے خود ہی توبہ سکھائی اور قبول کی۔

حضرت قتادہ کہتے ہیں: آدم علیہ السلام نے معافی مانگی اور ابلیس نے مہلت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا سوال پورا کر دیا۔ "اعطٰی کلّ واحدٍ منهما الذی سألہ"

(۲۶)

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الاعراف آیت ۴۷)

"اے ہمارے مالک، ہمیں ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کر۔"

یہ دعا اعراف اس روز کریں گے جس روز اللہ تعالیٰ کے دربار میں انسانوں کے مقدمات کا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں تین گروہ سامنے آئیں گے۔ ایک اصحاب الجنّۃ یعنی وہ لوگ جو اللہ کی ہدایات کے مطابق دنیا کی زندگی میں عمل کرتے رہے اور روزِ فیصل ان کا کھاتہ درست پایا گیا اور انہیں جنّت میں داخلے کا پروانہ عطا ہوا۔ دوسرے اصحاب النّار یعنی وہ لوگ جنہوں نے احکامِ ربّانی کو پس پشت ڈالے رکھا اور دنیا میں طاغوت بنے رہے یا طاغوتی طاقتوں کے گماشتے اور خدمتگار بن کر حق کی راہ روکتے رہے۔ انہیں ان کے اعمال و کردار کی سزا میں واصلِ جہنّم کیا جائے گا اور یہ اپنے کیے کا مزہ چکھتے رہیں گے۔ تیسرے اصحاب الاعراف یعنی وہ لوگ جن کی زندگی کا نہ تو مثبت پہلو ہی اتنا قوی ہوگا کہ اہلِ جنّت میں ان کو شامل کیا جائے اور نہ ہی منفی پہلو ہی اتنا خراب ہوگا کہ دوزخ میں پھینک دیئے جائیں اس لیے وہ جنّت اور دوزخ کے درمیان ایک سرحد پر (بعض روایات کے مطابق ایک دیوار یا فصیل پر) رہیں گے۔ یہی سرحد یا فصیل اعراف کہلاتی ہے۔ ان لوگوں کو اصحاب الاعراف کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ جب اپنے مقام سے اہلِ جنّت کو دیکھیں گے تو ازحد خوش ہوں گے اور انہیں سلام کہیں گے۔ پھر وہ اہلِ دوزخ کی جانب نظر دوڑائیں گے تو ان کی دردناک حالت دیکھ کر پکار اٹھیں گے۔

"اے مولا ہمیں ان ظالموں کے ساتھ دوزخ کا ایندھن نہ بنائیو۔"

یہ اصحابِ اعراف اہلِ دوزخ و اہلِ جنّت سے گفت گو کر سکیں گے۔ ان کا ایک مکالمہ (اہلِ دوزخ کے ساتھ) قرآن مجید میں مذکور ہے۔ وہ انہیں کہیں گے "تم دنیا میں بڑے جتھے بنا کر پھرتے تھے اور تم نے اللہ کی زمین پر تکبّر کا رویّہ اختیار کر رکھا تھا مگر آج تمہارا غرور خاک میں مل گیا ہے۔ تم تو دنیا میں اہلِ حق کو دیکھ کر قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ان کو اللہ کی رحمت ہرگز نہیں مل سکتی۔ (دنیا میں اہلِ حق کی ظاہری کمزوری و تنگدستی کی وجہ سے) مگر آج تو وہ

باغات کے مالک اور اپنے رب کی رحمت کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ انہیں آج نہ کوئی خوف ہے نہ رنج۔"

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب الاعراف بعد میں اہل جنت کے ساتھ جائیں گے قرآن کے الفاظ ہیں " لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ۝ " (وہ ابھی تک مقام اعراف پر ہوں گے۔ جنت میں ابھی داخل نہیں ہوں گے مگر اس کے امیدوار ضرور ہوں گے) علاوہ ازیں ان کی یہ دعا اور پھر اصحاب النار سے ان کا مکالمہ نیز احادیث رسول سے ثابت ہے کہ یہ لوگ بالآخر جنت میں داخل کیے جائیں گے اور انعامات الٰہیہ کے حقدار قرار پائیں گے۔

اہل دوزخ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہی دوزخ میں جائیں گے۔ ان کے یہ کرتوت دنیا میں نظر آجاتے ہیں۔ اہل حق کو ایسے لوگوں کی حرکات اور کردار دیکھتے ہی اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور زبان سے بھی یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ ان ظالموں کے اعمال سے انہیں محفوظ رکھے اور عملاً بھی ایسے کاموں سے مجتنب رہنا چاہیے۔

(۲۷)

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ۝

(الاعراف آیت: ۸۹)

" اے ہمارے مالک، ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی دعا ہے جس میں ان کے صحابہ بھی شامل تھے۔ حضرت شعیب اللہ کے پیغمبر تھے۔ آپ کو مدین میں نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ قوم مدین دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدیان کی نسل سے تھی! اسی وجہ سے اسے بنو مدیان یا بنو مدین کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم کے یہ فرزند حجاز سے شمالی جانب آباد ہوئے تھے اور ان کی اولاد قرب و جوار کے علاقے میں پھیل گئی۔ اس قوم کا علاقہ بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے اور جزیرہ نمائے سینا کے

مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقے کے جنوب مشرق میں حجاز اور شمال میں فلسطین تھا۔ یہ لوگ دونوں قبلوں (بیت المقدس اور بیت اللہ) کے درمیان میں آباد تھے۔ بنو مدین کا علاقہ اپنے حدود اربعہ اور محل وقوع کے لحاظ سے بہت اہم سیاسی و معاشی خطہ تھا۔ معاشی لحاظ سے دیکھیں تو یمن سے شام براستہ مکہ اور ینبوع کا تجارتی راستہ اس قوم کی بستیوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ اسی طرح عراق سے مصر جانیوالی شاہراہ تجارت بھی اس علاقے میں سے گزرتی تھی۔ پھر اس تجارتی مرکز کی وجہ سے اس قوم کو سیاسی قوت بھی حاصل تھی کیونکہ تجارتی قافلے جن قبیلوں سے گزرتے تھے ان کی سیاسی لحاظ سے بھی بڑی عزت اور قدر ہوتی تھی۔

حضرت شعیب علیہ السلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے چھ سات صدیاں بعد مبعوث ہوئے۔ ان کی قوم قریش مکہ کی طرح دعویٰ یہی رکھتی تھی کہ وہ دین ابراہیم کی مومن ہے مگر عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ حضرت شعیب کی بعثت کے وقت اس قوم میں شرک اور تجارتی خیانت و بد معاملگی زوروں پر تھی۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے غارت گری و فساد بھی برپا کر رکھا تھا آپ اپنے جد اعلیٰ ابراہیم خلیل اللہ کا دین زندہ کرنے آئے تھے۔ جب اس بگڑی ہوئی قوم کے سامنے آپ نے پیغام حق پیش کیا تو قوم مخالفت پر اتر آئی۔ آغاز کار میں تو مخالفت زبانی حد تک تھی مگر آہستہ آہستہ یہ مخالفت تیز ہوتی گئی اور بالآخر سرداران قوم نے یہاں تک دھمکی دیدی کہ "لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ" (اگر تیرے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے۔) اس انتہائی دھمکی کے باوجود حضرت شعیب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "تم اپنی جگہ جو کچھ کر سکتے ہو کر دیکھو، میں اپنی راہ سے نہیں ہٹوں گا۔" اس کے بعد سرداران قوم کے ساتھ ایک طویل کشمکش چلتی رہی۔ حضرت شعیب اور ان کے مٹھی بھر ساتھی اپنی راہ سے ہٹنے والے نہیں تھے۔ کوئی رکاوٹ ان کا راستہ نہ روک سکتی تھی۔ قوم نے آخری الٹی میٹم دے دیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

"لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا"

(اے شعیب، تجھے اور تیرے ساتھ ایمان لانے والوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا یا پھر ہم تم سب کو اپنی بستی سے جلاوطن کر دیں گے۔) اس کے جواب میں بھی آنجناب نے فرما دیا۔ "جس تاریکی سے ہمیں خدا نے نکال لیا ہے اور روشنی کی دولت بخشی ہے اس تاریکی میں ہم

دوبارہ نہیں جائیں گے اور انشاء اللہ اپنے نظریے کی سربلندی کی خاطر اپنے موقف پر ڈٹے رہیں گے۔"

حضرت شعیب نے قوم کو یہ دو ٹوک جواب دینے کے بعد اپنے مالک کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے اور عرض کیا: "(اے مولا! تو جانتا ہے کہ میں نے مقدور بھر اس قوم کی اصلاح کی کوشش کی ہے مگر ان لوگوں کی سرکشی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اب انہوں نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو الٹی میٹم دے دیا ہے تو ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہم تو تجھ سے یہی درخواست کرتے ہیں کہ تو) ہمارے درمیان اور ان باغیوں کے درمیان فیصلہ فرما دے، اور تجھ سے بہتر فیصلہ کرنیوالا کون ہے؟"

ادھر حضرت شعیب علیہ السلام یہ دعا فرما رہے تھے اور ادھر مجیب الدعوات اس کے جواب میں فیصلہ صادر کر رہا تھا۔ ایک دہلا دینے والا عذاب ان باغیوں پر نازل ہو گیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ وہ اس طرح برباد کر دیئے گئے کہ جیسے کبھی دنیا میں ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ حضرت شعیب اور ان کے مومن ساتھی اس عذاب سے بچا لیے گئے اہلِ مدین کی تباہی ایسی ضرب المثل بن گئی کہ گرد و نواح کے تمام علاقوں میں کہا جانے لگا فلاں چیز اس طرح برباد ہو گئی ہے جیسے اہلِ مدین۔ انبیائے بنی اسرائیل کی تقاریر اور صحائف میں بھی اہلِ مدین کی تباہی بطور ضرب المثل مذکور ہوئی ہے۔

(استفادہ از تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵۴ تا ۵۸)

(۲۸)

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۝ (الاعراف آیت: ۱۲۶)

" اے پروردگارِ حقیقی (ہم تجھ پر ایمان لا چکے ہیں) تو ہمیں صبر کی دولت سے مالا مال کر دے اور ہمیں موت آئے تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں۔"

یہ مختصر دعا نہایت معرکۃ الآرا دعا ہے۔ یہ دعا تختۂ دار پر چڑھنے سے پہلے اللہ کے بندوں

نے اللہ کے دربار میں بھیجی تھی ۔ یہ دعا مانگنے والے کون تھے ؟ یہ وہ لوگ تھے جنہیں دنیا جادوگر کے نام سے جانتی تھی ۔ یہ فرعون کے دربار میں کلیم اللہ کو اپنے جادو کے زور سے شکست دینے آئے تھے ۔ معجزاتِ موسیٰ بڑے حیرت انگیز اور پُراثر معجزات تھے لیکن یہ معجزہ کہ جادوگروں کی زبان اس دعا سے تر ہوگئی دنیا کی تاریخ میں ایک نادرہ جاوید واقعہ اور ناقابلِ فراموش یادگار کی حیثیت سے ہمیشہ درخشاں رہے گا ۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مدین سے مصر کی جانب سفر کرنیوالا ایک مسافر دامنِ طور میں سخت بارش ، سردی اور طوفان سے بچنے کے لیے آگ کی تلاش میں نکلتا ہے اور تاریکیٔ شب میں اسے نورِ رسالت سے نواز دیا جاتا ہے اور کتنا حیرت انگیز ہے یہ منظر کہ اس نورِ رسالت کو بجھانے کے لیے فرعون کے دربار میں کچھ نامور جادوگر جمع ہوتے ہیں مگر آناً فاناً وہ اس نور کی شمع کو اور تیز کرنے کے لیے پھانسی کے پھندوں کو پروانہ وار چوم لیتے ہیں ۔ یہ اللہ کی حکمت و قدرت ہے جیسے وہی سمجھتا ہے ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادیٔ ایمن میں تاجِ نبوّت پہنانے کے بعد حکم ہوا کہ فرعون کے دربار میں جاکر اسے راہِ حق کی دعوت دیں ۔ آپ نے ایک قبطی کو کچھ عرصہ قبل اپنی مدین کو روانگی سے پہلے قتل کیا ہوا تھا نیز آپ کی زبان میں لکنت بھی تھی اس لیے آپ نے اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے لیے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون کا نام پیش کیا ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون کو بھی ان کے ساتھ معاون پیغمبر بنا دیا اور حکم ہوا کہ بغیر کسی خوف و خطر کے تم دربارِ فرعون میں چلے جاؤ اور اسے سمجھاؤ کہ اس کا دعویٔ خداوندی بالکل غلط اور باطل ہے ۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں بڑی تفصیل کے ساتھ کئی مواقع پر آیا ہے ۔

حضرت موسیٰ حسبِ حکم دربارِ شاہی میں چلے گئے اور فرعون کو مخاطب کرکے اس کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کر دی ۔ کافی سوال و جواب ہوئے ۔ آخر فرعون نے کہا ۔ " اگر تو اللہ کا پیغمبر ہے تو لا کوئی نشانی پیش کر ۔ " آپ نے اپنا عصا زمین پر پھینکا تو وہ بہت بڑا اژدہا بن گیا اور اپنا ہاتھ بغل میں دبا کر باہر نکالا تو یہ روشنی کا منبع بن گیا ۔ یہ معجزات عطائے نبوّت کے وقت ہی وادیٔ طور میں حضرت موسیٰ کو دیئے گئے تھے ۔ ان معجزات کو دیکھ کر فرعون سمجھا کہ یہ سب جادو کا کرشمہ ہے ۔ اس نے اپنی مجلسِ مشاورت طلب کی اور اہل الرائے

لوگوں سے پوچھا "اب بتاؤ کیا کرنا چاہیئے۔ یہ تو ایک بڑا جادوگر ہے۔" درباریوں نے کہا "ہم ملک کے نامور جادوگروں کو بلا لاتے ہیں اور ان دونوں بھائیوں کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دیتے ہیں۔" فیصلہ کے مطابق جادوگر ملک بھر سے اکٹھے ہو گئے اور قبطیوں کی عید کے روز مقابلہ شروع ہوا۔ مقابلہ شروع ہونے سے قبل جادوگروں سے فرعون کی خصوصی ملاقات ہوئی جس میں یہ اعلامیہ طے ہو کر "شائع" ہوا کہ اگر درباری جادوگر غالب آ گئے تو انہیں دربار میں مقربین کی صف میں جگہ ملے گی۔

وقتِ مقررہ پر دونوں فریق مقابلے کے میدان میں پہنچ گئے۔ جادوگروں نے پوچھا، "اے موسیٰ پہلے ہم کرتب دکھائیں یا تو آپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔" آپ نے فرمایا "تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو۔" ان لوگوں نے اپنی چھڑیاں اور رسیاں زمین پر پھینک دیں۔ وہ جادو کے زور سے انہیں سانپوں کا روپ دے کر سارے میدان میں دوڑانے لگے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اللہ کا نام لے کر اپنا عصا زمین پر پھینک دیں۔ آپ نے عصا پھینکا تو بہت بڑا اژدہا بن گیا اور سب سانپوں کو نگل گیا۔ یہ منظر سارے مجمع پر رعب و مصیبت طاری کرنے کے لیے کافی تھے۔ فرعون اور اس کے درباری جو اب تک کامیابی کی امید لگائے بیٹھے تھے بھونچکے رہ گئے! ادھر جادوگروں نے یہ حال دیکھا تو دل کی آنکھیں ایک دم کھل گئیں۔ سمجھ گئے کہ موسیٰ کے ہاتھوں جو کچھ رونما ہوا ہے وہ جادو نہیں۔ وہ تو کوئی ایسی قوت ہے جس کا مقابلہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔ وہ اسی جگہ مجمع عام میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے اور زبان سے اقرار کیا۔ "اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ ۝" (ہم رب العالمین پر ایمان لائے جو کہ موسیٰ و ہارون کا ربّ ہے) فرعون یہ دیکھ کر اور بھی سیخ پا ہو گیا۔ کہنے لگا "میں سمجھ گیا ہوں۔ یہ تمہارا جادوگری میں استاد ہے تم نے اس کے ساتھ مل کر ملک کے ساتھ سازش کی ہے۔ میں ابھی تمہیں تمہارے کیے کی سزا دیتا ہوں۔ تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تم سب کو تختہ دار پر لٹکا دوں گا۔"

جادوگر جو اب حلاوتِ ایمانی کا مزہ چکھ چکے تھے بے جھجک بولے۔ "ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہے۔ تو جو چاہے کر لے ہم اللہ کی آیات دیکھ کر مومن بن چکے ہیں۔"

پھر جب ان کی پھانسی کا حکم ہوا تو انہوں نے اپنے مولا کے سامنے درخواست پیش کی۔

"اے ہمارے مالک! ہماری جبینِ نیاز تو اب سوائے تیرے کسی کے سامنے نہ جھکے گی۔ تو ہمیں ثابت قدمی و صبر کی دولت بخش اور موت ہم پر اس حال میں بھیج کہ ہم تیرے مطیع فرمان ہوں۔"

یہ دعا کتنی انقلابی ہے اور کیسے انقلابی لوگوں نے مانگی تھی! وہ لوگ کہ جن کی زندگی جادوگری میں گزر گئی حقیقت حال کھل جانے کے بعد ایسے مسلم بنے کہ گردن کٹ جانے کی قطعاً کوئی پرواہ نہ کی۔ اس سے بڑا انقلاب اور کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسلام کا دعویٰ کرنے والے ہر فرد کو یہی جذبۂ صادق و عزم پُر خلوص عطا فرمائے۔ (آمین)

ان اہلِ ایمان کی روشن کی ہوئی یہ شمع ہر دور میں اہلِ ایمان کے خون سے سیراب ہوتی رہی اور اپنی نورانی کرنیں عالمِ ہست و بود میں بکھیر کر اہلِ وفا کو راستہ سجھاتی رہی۔ خبیب بن عدی نے مکہ میں اس کی لو تیز کی اور تاریخ کے ہر دور میں ان کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ کتنے ہی پروانے اس شمع پر نچھاور ہو گئے۔ ہمارے زمانے میں سید قطب شہید، عبدالقادر عودہ شہید اور ان کے عالی قدر رفقاء نے سرزمین فرعون میں ایک مرتبہ پھر اس سنت کو تازہ کر دیا۔ وادیٔ نیل کے ان شہداء کے مبارک چہروں کی مسکراہٹ قافلۂ راہِ حق کے راہیوں کے سامنے آج بھی پھولوں کی طرح بکھری ہوئی ہے اور ان کے مقدس خون کی مہک سے سارا عالم معطر ہے۔

(۲۹)

سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الاعراف، آیت: ۱۴۳)

"(اے مولا!) تیری ذات پاک ہے۔ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے ایمان لانے والا میں ہوں۔"

یہ توبہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی زبانی اللہ کے حضور پیش کی گئی۔ حضرت موسیٰ کو خدا تعالیٰ نے اپنے کلام سے نوازا تھا۔ نبی نوعِ آدم میں سے حضرت موسیٰ ہی وہ ہستی ہیں کہ جو ایک طویل

عرصہ تک ربِّ جلیل سے بلا واسطہ ہم کلامی سے مشرف ہوتے رہے۔ آپ کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ جس طرح میں اللہ کا کلام سنتا ہوں اسی طرح میں اس منبعِ نور کی زیارت سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کروں تو زہے نصیب۔ یہ آرزو دل میں پلتی رہی اور آپ موقع کی تلاش میں رہے۔ آخر ایک دن اللہ کی دعوت پر آپ کوہ طور پر چلّہ کشی کے لیے تشریف لے گئے اللہ تعالیٰ سے جب ہم کلام ہوئے تو وہ مچلتی ہوئی آرزو زبان پر آگئی۔ عرض کیا۔ "رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ" (مولا مجھے اپنا دیدار کرا دو) اللہ تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ "موسیٰ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ قائم رہا تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام حسبِ حکم پہاڑ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب پہاڑ پر اللہ نے تجلّی کی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ غش کھا کر گر پڑے۔ پھر جب انہیں ہوش آیا تو وہ پکار اٹھے۔ "(اے مولا) تیری ذات پاکیزہ ہے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں۔"

۳۰

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ع (الاعراف، آیت: ۱۵۱)

"اے میرے مالک، مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما تو سب سے بڑھ کر رحم کرنیوالا ہے۔"

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے۔ آپ جب الواحِ تورات لینے کے لیے طور پر گئے تو قوم کو دامنِ کوہ میں حضرت ہارون کی قیادت میں دے گئے۔ حضرت ہارون کو نصیحت کی کہ وہ اصلاح کی کوشش کرتے رہیں اور بگاڑ پیدا کرنیوالوں کی راہ پر نہ چلیں حضرت موسیٰ کے جانے کے بعد سامری نے سونے کا ایک بچھڑا بنا کر جادو کے زور سے اس میں سے آواز پیدا کر دی۔ قومِ موسیٰ پہلے بھی مصر سے نکلنے کے بعد ایک مقام پر حضرت موسیٰ سے

کہہ چکی تھی۔ "اجْعَل لَّنَا إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ" (اے موسیٰ ہمارے لیے بھی ایک مجسّم الٰہ بنادو جس طرح اس قوم کا الٰہ (دیوی) ہے۔) اس پر حضرت موسیٰ نے انہیں خوب ڈانٹا تھا۔ اب مصر میں بت پرستوں کے ماتحت طویل عرصہ تک رہنے والی یہ قوم حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں سامری کے طلسم میں گرفتار ہوگئی۔ ان لوگوں کی پرستش گوسالہ کی حالت تو یہ تھی کہ گویا وہ بچھڑا ان کے دلوں میں رچ بس گیا تھا۔ "وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ" حضرت ہارونؑ نے بہت کوشش کی کہ قوم کو اس کفر سے باز رکھیں مگر قوم کہاں ماننے والی تھی۔ وہ تو حضرت ہارونؑ کو قتل کرنے کے لیے بے تاب تھے! ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ تیرے پیچھے تیری قوم سامری کی جادوگری سے گمراہ ہوگئی ہے۔ حضرت موسیٰ جلدی سے اللہ تعالیٰ سے اجازت لیکر واپس لوٹے۔ وہ شدید غصے میں تھے۔ انہوں نے قوم کو خوب ڈانٹا اور سامری پر لعنت بھیجی جس کی وجہ سے وہ زندگی بھر ملعون مجسّم بنا پھرتا رہا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کے بال پکڑ لیے اور کھینچنے لگے کہ انہوں نے کیوں نہ اپنا فریضۂ نبوّت ادا کیا۔ حضرت ہارون نے جواب دیا۔ " اے میرے ماں جائے بھائی اس قوم نے مجھے کمزور جانا اور قریب تھا کہ میری نصیحت سے برافروختہ ہوکر مجھے قتل کر دیا جاتا۔ پس ان دشمنوں کے سامنے میری سبکی نہ کیجئے اور نہ ہی مجھے اس ظالم قوم کے ساتھ شامل کیجئے۔"

حضرت ہارون کا یہ عذر اور وضاحت سن کر حضرت موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور انہوں نے حضرت ہارون کو سینے سے لگا لیا۔ پھر اللہ کے حضور میں اپنے لیے اور اپنے بھائی کے لیے یہ دعا مانگی۔

(۳۱)

أَنتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ○

(الاعراف، آیت، ۱۵۵)

"(اے اللہ) ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ پس ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے، آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں۔"

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے۔ گوسالہ پرستی کا جو جرم عظیم قوم نے ان کی غیر حاضری میں کیا تھا اس پر آنجناب کو سخت صدمہ تھا۔ قوم بھی آپ کے آنے کے بعد اور آپ کی ملامت سننے پر خاصی نادم ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس گناہ کی تلافی کے لیے بنی اسرائیل سے ستر نمائندے چنے اور انہیں لے کر کوہِ طور پر بارگاہِ ربانی میں حاضر ہوئے۔ اللہ تعالےٰ اس قوم کی بدعہدی کو خوب جانتا تھا۔ یہ وہی قوم تھی جو بار بار گناہ کرتی، پھر معافی مانگتی اور آئندہ کے لیے نیک چلنی کا وعدہ کرتی مگر تھوڑے سے ہی عرصہ بعد اس کے وہی لچھن دوبارہ سامنے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان نمائندگان کو پختہ یاددھانی کرانے اور ایفائے عہد کا سبق دینے کے لیے ایک زلزلہ ان پر نازل کیا۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ آئندہ کے لیے یہ محتاط رہیں اور خوف خدا ان کے دلوں میں موجزن ہو۔ اس زلزلے کے سبب تمام نمائندگانِ بنی اسرائیل بے ہوش ہو گئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ بس اب وہ ہلاک ہی ہو جائیں گے۔

اس زلزلے کے آتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یوں کلام کیا۔ "اے میرے مالک! اگر آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا، (یعنی گوسالہ پرستی) ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعے سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں"

یہ حقیقت حال واضح کرنے کے بعد پھر اللہ کا پیغمبر اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ پہلی دعا میں تو آپ نے اپنی ذات اور اپنے بھائی حضرت ہارون کی ذات کے لیے ہی مغفرت طلب کی تھی مگر یہاں آپ نے دعا میں ساری قوم کو شامل کر لیا ہے۔ وہ دعائے مغفرت کرنے سے پہلے یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کا سرپرستِ حقیقی ہے اور اسی کی توفیق و حفاظت سے نیکی کا حصول اور برائی سے اجتناب ممکن ہے۔

(۳۲)

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ (الاعراف، آیت: ۱۵۶)

"(اے مولا) ہمارے لیے دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے اور آخرت کی بھی، ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا۔"

یہ بھی حضرت موسیٰ ہی کی دعا ہے اور گزشتہ سے پیوستہ ہے جس طرح سورۂ بقرہ میں مومنین کی یہ نشانیاں بیان کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں بھی بھلائی کے طلب گار رہتے ہیں اور آخرت میں بھلائی چاہتے ہیں اسی طرح یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی دعا میں دنیا کی بھلائی کی درخواست کرتے ہوئے آخرت کی بھلائی کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔

اس دعا کے جواب میں ارشاد ہوا "میرا عذاب تو جسے میں چاہوں پکڑ لیتا ہے مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔" گویا کہ اللہ کی حکومت اور خدائی میں اصل چیز اس کا غضب نہیں ہے کہ جس میں کبھی کبھار فضل اور رحم نمودار ہو جاتا ہو بلکہ اصل چیز رحم ہے جس پر سارا نظام عالم قائم ہے۔ اس رحم میں غضب تو صرف اس وقت نمودار ہوتا ہے جب بندوں کا تمرّد حد سے فزوں ہو جاتا ہے۔ (ماخوذ از تفہیم القرآن، جلد دوم حاشیہ ۱۱۱)

(۳۳)

حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ (التوبہ، آیت: ۱۲۹)

"میرے لیے اللہ بہت کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور عرش عظیم کا مالک ہے۔"

یہ کلمات توکل سورۂ توبہ کے آخری کلمات ہیں۔ ان کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دی گئی اور آپ کی وساطت سے پوری ملّتِ اسلامیہ

اس تعلیم کی مخاطب بن گئی۔ سورۂ توبہ کی آخری دو آیات سے پہلے تفصیل کے ساتھ منافقین کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے امراضِ قلبی و روحانی پر نشتر چلا کر انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنی حرکات شنیعہ سے باز آ جائیں۔ اسلام کی مضبوط بنیادوں کو متزلزل کر دینے کی ہمت ان میں نہ ہے نہ پیدا ہو سکتی ہے۔ اسلام کی مخالفت کر کے اور درپردہ سازشیں کر کے وہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ اگر وہ تائب ہو جائیں اور سچے دل سے اللہ کے سامنے جھک جائیں تو ان کے گناہوں کی معافی میں دیر نہیں لگ سکتی جیسا کہ پہلے کی آیات میں غزوہ تبوک کے پیچھے رہ جانے والے تین مخلص مومنین کی توبہ اور اللہ کی طرف سے ان کی مغفرت کا واقعہ بیان ہوا ہے۔

منافقین مدینہ میں بہت بڑا فتنہ تھے۔ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے۔ یہ مارِ آستین ایک طرف تو اسلام کے دشمنوں سے خفیہ ساز باز رکھتے اور دوسری طرف مسلمانوں میں قسم قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرتے رہتے۔ جب کبھی کوئی سورہ نازل ہوتی تو سادہ لوح مسلمانوں سے ازراہِ شرارت و خبث باطنی پوچھتے "اس آیت سے تم میں سے کسی کے ایمان میں اضافہ ہوا ہے۔" اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا ہے کہ مومنین کے ایمان میں تو اضافہ ہی ہوتا ہے البتہ منافقین کے دلوں پر نجاست کے ساتھ اور نجاست کا پردہ چڑھ جاتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ساری نوعِ انسانی کے لیے حد درجہ شفیق و رحیم تھے۔ آپ کے دل کی آرزو تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آگ سے بچا لیں۔ جب لوگ نہیں مانتے تھے تو آپ کو دلی صدمہ ہوتا تھا۔ قرآن مجید اور حدیث شریف میں آپ کی اس کیفیت کا تذکرہ بہت آیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو منافقین کی صفات بد کا ذکر فرمایا ہے اور ساتھ ہی حضور اکرم کی رقتِ قلب کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور دوسری طرف حضور اکرم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بجائے گھبرانے کے اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھیں، اس کی مدد شاملِ حال ہے تو پورا زمانہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ○

(التوبہ: ۱۲۸) دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا

اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانیوالوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔ پیار بھرے انداز میں اپنے محبوب پیغمبر کی صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

"اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبیؐ ان سے کہہ دو کہ میرے لیے میرا اللہ کافی ہے......... الخ"

(۴۲)

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ (یونس آیت: ۸۵-۸۶)

"اے ہمارے پروردگار ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات بخش۔"

یہ دعا ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ہے جنہوں نے فرعون کے خوف اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کی مصلحت کیشوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سخت طوفانی دور میں حضرت موسیٰ کی دعوتِ حق کا ساتھ دیا۔ قرآن مجید میں انہیں "ذُرِّيَّةٌ" کہا گیا ہے جس کے معنی اولاد کے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جن حالات میں نعرۂ حق بلند کیا تھا وہ بڑے ہی حوصلہ آزما اور کٹھن تھے۔ ملک میں ایسی آمریت قائم تھی کہ آمر نے اپنے آپ کو "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" کے روپ میں قوم و ملک پر مسلط کر رکھا تھا۔ ایسے حالات میں ایک شخص جس کا تعلق غلام قوم سے ہے اٹھتا ہے اور صرف ایک ساتھی کی معیت میں اس طاغوت اور اس کے نظامِ باطل کو چیلنج کر دیتا ہے۔ وہ کھلم کھلا اعلانِ بغاوت کر دیتا ہے اور بھرے دربار میں علی الاعلان کہتا ہے "میرا رب وہی ہے جو زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا رب ہے۔"

یہ اعلان کرنا اپنے ساتھ جیسی کچھ آزمائشیں لایا وہ ہر اس شخص کے ذہن میں فوراً آجاتی ہیں جس نے دنیا کی تاریخِ آمریت کا مطالعہ کیا ہو۔ ابتلا و امتحان کی اس چکی میں پسنے کے لیے بہت کم لوگ اپنے آپ کو آمادہ کر سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰ پر بھی بڑے بزرگوں اور عمر رسیدہ لوگوں نے ایمان لانے سے گریز کیا۔ نوجوان نسل بہرحال میدان میں نکل آئی اور

حضرت موسیٰ کے ساتھ عہدِ وفا باندھا۔ دنیا میں اسلامی انقلاب کے لیے ہمیشہ نوجوانوں اور کم عمر لوگوں نے ہی اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ حضرت ابراہیم کی انقلابی دعوت پر ان کی بیوی سارہ کے علاوہ صرف ان کے بھتیجے حضرت لوط نے ہی لبیک کہی تھی اور وہ اس موقع پر ایک نوخیز جوان تھے۔

اصحاب کہف جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے نہایت پیار بھرے انداز میں کیا ہے نوجوان لوگ ہی تھے۔ جب پوری قوم دینِ حق سے منہ موڑ کر بادشاہ کی اتباع میں مبتلائے کفر ہوئی تو ان نوجوانوں کو اپنے دین و ایمان کی فکر لاحق ہوئی۔ انہوں نے جائزہ لیا کہ آیا وہ قوم کے اندر رہ کر اصلاحِ احوال کی کوشش کریں تو یہ بار آور ثابت ہوگی۔ تجربہ نے بتایا کہ نہیں اس کا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ اُلٹا قوم کے بُرے اثرات اور مسموم فضا میں اپنا دامن آلودہ کرنے کا خطرہ موجود ہے۔ ان لوگوں نے گھر بار چھوڑے اور حضرت ابراہیم کی طرح ہجرت کر گئے۔ حضرت ابراہیم نے بھی کہا تھا اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ان لوگوں نے بھی کہا کہ قوم جس رنگ میں رنگ چکی ہے اس میں رنگ جانا تو ظلم ہوگا۔ آؤ یہاں سے نکل چلیں اور غاروں میں جا کر دین کی حفاظت کریں۔" کیا شان ہے ان نوجوانوں کی کہ جنہیں سب سے زیادہ فکر ہے تو اپنے دین کی۔

آغاز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لانیوالے لوگ بھی بالکل نوجوان تھے۔ ان کی اکثریت بیس سال سے کم عمر تھی۔ حضرت علی تو صرف بارہ سال کے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت جعفر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت مصعب ابن عمیر، حضرت ارقم بن ارقم اور عبداللہ بن مسعود کی عمریں بیس سال سے کم تھیں۔ حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، بلال، صہیب اور خباب کی عمریں بیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ ابو عبیدہؓ ابن جراح، زیدؓ بن حارثہ، عثمان بن عفان، عمرؓ بن خطاب اور زید بن خطاب ۳۰ اور ۳۵ سال کے درمیان تھے۔ حضرت ابوبکر کی عمر قبول اسلام کے وقت ۳۷ سال تھی۔ صرف چار صحابہ عمر میں آپ سے بڑے تھے۔ (۱) حضرت خدیجہ (ام المومنین) (۲) حضرت سمیہؓ[1] اسلام کی سب سے پہلی شہیدہ (۳) آپ کے چچا زاد بھائی شہید بدر حضرت عبیدہ بن حارث مطلبی

---

[1] حضرت سمیہ حضرت عمار کی والدہ تھیں۔ انہیں قبول اسلام کی پاداش میں مکہ میں بڑی اذیتیں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۴) حضرت عمار کے والد حضرت یاسرؓ اور ایک صحابی حضرت عمار آپ کے ہم عمر تھے۔ یہی ابتدائی دور میں پرچم حق کو تھامنے والے اور مکہ کی سرزمین کفر میں حق کا پیغام سنانے والے مجاہدین تھے۔

ہمارے دور میں یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ نوجوان طبقہ ایک اچھی خاصی تعداد میں اسلامی انقلاب کے لیے سرگرم عمل ہے۔ یہ سربکف مجاہدین اپنے میدان میں بلاشبہ کامیاب و کامران بھی ہیں۔ خدا کرے کہ ہمہ گیر اسلامی انقلاب کے لیے ان کی کاوشیں بامراد ثابت ہوں۔

حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والے نوجوانوں پر جب مشکلات نازل ہوئیں تو قوم کے بڑے بوڑھے سخت پریشان تھے۔ انہوں نے خود تو پیغام حق کو قبول نہیں کیا تھا مگر ان نوجوانوں کا فیصلہ بھی ان "دیدہ وروں" کے نزدیک "جذباتی اور غیر عقلی" فیصلہ تھا انہیں حق کا ساتھ نہ دینے کے باوجود ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ مرے کہ مرے۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے یہاں تک کہہ دیا۔ "تمہاری اور ہماری مثال ایسی ہے کہ جیسے بھیڑیا بکری پر حملہ کر دے اور چرواہا اسے چھڑانے کی کوشش کرے۔ دونوں کی کھینچا تانی میں بکری کے پرخچے اڑ جائیں۔"

حضرت موسیٰؑ کو اب دلچسپی تھی تو ان قیمتی نوجوانوں سے جنہوں نے "ہرچہ بادا باد" کہہ کر آپ کا ساتھ دینے کا عزم باندھ لیا تھا۔ آپ ان نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں "تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اب ہر مشکل وقت میں اسی پر توکل اور بھروسہ کرو۔" انہوں نے جواب میں کہا "ہم نے اللہ پر ہی بھروسہ کیا ہے۔" اس کے بعد انہوں نے مندرجہ بالا دعا مانگی۔ دعا کے الفاظ بالکل واضح ہیں۔ کافر اور ظالم قوم سے سابقہ درپیش تھا، اس کی چیرہ دستیوں کے مقابلے پر اللہ کی مدد مانگی گئی ہے۔ تاہم دعا میں یہ الفاظ کہ "ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنا" بہت گہرے معانی رکھتے ہیں۔ ان کے معانی سمجھنے کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ) دی گئیں۔ انہیں ابوجہل نے نیزہ مار کر شہید کر دیا تھا۔ یہ سب سے پہلا جام شہادت تھا جو ایک خاتون کے حصے میں آیا۔ رضی اللہ عنہا رضت عنہ

لیے ہم اپنے دور کے عظیم مفسر اور واقفِ رموز و معانیٔ قرآن مرشد مودودی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مرشد اپنی تفہیم القرآن جلد دوم حاشیہ ۸۳ میں ان الفاظ کا مفہوم یوں واضح کرتے ہیں۔

"ان صادق الایمان نوجوانوں کی یہ دعا کہ "ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا" بڑے وسیع مفہوم پر حاوی ہے۔ گمراہی کے عام غلبہ و تسلط کی حالت میں جب کچھ لوگ قیامِ حق کے لیے اٹھتے ہیں، تو انہیں مختلف قسم کے ظالموں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک طرف باطل کے اصلی علمبردار ہوتے ہیں جو پوری طاقت سے ان داعیانِ حق کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف نام نہاد حق پرستوں کا ایک اچھا خاصا گروہ ہوتا ہے جو حق کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر باطل کی قاہرانہ فرماں روائی کے مقابلہ میں اقامتِ حق کی سعی کو غیر واجب، لاحاصل، یا حماقت سمجھتا ہے اور اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اس خیانت کو جو وہ حق کے ساتھ کر رہا ہے کسی نہ کسی طرح درست ثابت کر دے اور ان لوگوں کو الٹا برسرِ باطل ثابت کر کے اپنے ضمیر کی اس خلش کو مٹائے جو ان کی دعوت اقامتِ دینِ حق سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جلی یا خفی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ تیسری طرف عامۃ الناس ہوتے ہیں جو الگ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ان کا ووٹ آخرکار اسی طاقت کے حق میں پڑا کرتا ہے جس کا پلّہ بھاری رہے، خواہ وہ طاقت حق ہو یا باطل۔ اس صورتِ حال میں ان داعیانِ حق کی ہر ناکامی، ہر مصیبت، ہر غلطی، ہر کمزوری اور ہر خامی ان مختلف گروہوں کے لیے مختلف طور پر فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ کچل ڈالے جائیں یا شکست کھا جائیں تو پہلا گروہ کہتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ تھا، نہ کہ ان بیوقوفوں کے ساتھ جو ناکام ہو گئے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ دیکھ لیا! ہم نہ کہتے تھے کہ ایسی بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکرانے کا حاصل چند قیمتی جانوں کی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہوگا اور آخر کار اس تھلکہ میں اپنے آپ کو ڈالنے کا ہمیں شریعت نے مکلف ہی کب کیا تھا۔ دین کے کم سے کم ضروری مطالبات تو ان عقائد و اعمال سے پورے ہو ہی رہے تھے جن کی اجازت فراعنۂ وقت نے دے رکھی تھی۔ تیسرا گروہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ حق وہی ہے جو غالب رہا۔ اسی طرح اگر وہ اپنی دعوت کے کام میں کوئی غلطی کر جائیں، یا مصائب و مشکلات

کی سہار نہ ہونے کی وجہ سے کمزوری دکھا جائیں، یا ان سے، بلکہ ان کے کسی ایک فرد سے بھی کسی اخلاقی عیب کا صدور ہو جائے، تو بہت سے لوگوں کے لیے باطل سے چمٹے رہنے کے ہزار بہانے نکل آتے ہیں اور پھر اس دعوت کی ناکامی کے بعد مدت ہائے دراز تک کسی دوسری دعوتِ حق کے اٹھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ پس یہ بڑی معنی خیز دعا تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھیوں نے مانگی تھی کہ خدایا ہم پر ایسا فضل فرما کہ ہم ظالموں کے لیے فتنہ بن کر نہ رہ جائیں۔ یعنی ہم کو غلطیوں سے، خامیوں سے، کمزوری سے بچا، اور ہماری سعی کو دنیا میں بارآور کر دے تاکہ ہمارا وجود تیری خلق کے لیے سببِ خیر بنے نہ کہ ظالموں کے لیے وسیلۂ شر۔“

۳۵

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓي اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ (یونس آیت: ۸۸)

”اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں، اے رب، ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔“

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے جس پر حضرت ہارون آمین کہتے رہے۔ مصر میں ایک طویل عرصہ فرعون کے ساتھ کشمکش برپا رہی۔ حضرت موسیٰ کے خلاف دربارِ شاہی میں طرح طرح کی سازشیں ہوئیں، آپ کے ساتھیوں پر مظالم ڈھائے گئے، انہیں قید بھی کیا گیا اور شہید بھی، انہیں معاشرتی تکالیف بھی دی گئیں اور معاشی وسیاسی میدان میں بھی ان سے انتقام لیا گیا۔ اس طویل دور میں حضرت موسیٰ اپنے ساتھیوں کو صبر اور حوصلے کی تلقین کرتے رہے۔

فرعون اور اس کے درباری چونکہ دنیوی لحاظ سے ٹھاٹھ باٹھ کے تمام سامان رکھتے تھے اس لیے خود انکارِ حق کا جرم کرنے کے ساتھ وہ دوسرے لوگوں کو بھی بزورِ قوت یا بزورِ زر صراطِ مستقیم سے بھٹکا رہے تھے۔ ان کا مال اور شان و شوکت حق کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ دعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

فرعون اور اس کے درباریوں کے حق میں یہ بددعا اللہ کے پیغمبر نے کسی گھبراہٹ کے عالم میں اور اچانک ہی نہیں کر ڈالی بلکہ ایک لمبے صبر آزما دور کے بعد آپ نے دیکھ لیا کہ اب اس قوم کے ہدایت پانے کا کوئی امکان نہیں ہے، بلکہ یہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے تو آپ نے یہ بددعا فرمائی۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس قوم کی مجرمانہ حرکات اور شقاوتِ قلبی کی وجہ سے یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اب عذاب ان پر نازل کیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ "جب تک یہ لوگ عذاب نہ دیکھ لیں ایمان نہ لائیں" یہ مفہوم نہیں رکھتا کہ عذاب دیکھنے کے بعد ایمان لے آئیں اور وہ مقبول ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کا تو یہ قاعدہ ہے کہ نزولِ عذاب سے پہلے تو وہ مہلت اور موقع دیتا ہے کہ کوئی فرد یا قوم توبہ کر لے اور ایمان لے آئے تو اسے معاف کیا جائے مگر جب عذاب کا فیصلہ ہو جائے تو پھر ایمان اور توبہ کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت میں ایمان لانا سودمند نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدہ کلیہ سے صرف حضرت یونس علیہ السلام کی قوم مستثنیٰ ہے جس کا تذکرہ سورۂ یونس آیت ۹۸ میں آیا ہے۔ اس کی وجہ بھی محض یہ ہے کہ قوم پر ابھی اتمامِ حجت نہیں ہوئی تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام قوم کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ پیچھے عذاب کے آثار دیکھ کر قوم گڑگڑائی اور پیغمبر کی تلاش کی مگر وہ نہ ملے۔ قوم کی یہ کیفیت دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے عذاب ٹال دیا۔ پوری نوعِ انسانی کی تاریخ میں یہی ایک واقعہ ہے کہ عذابِ عام کا حکم ہو جانے کے بعد کسی قوم کو اس عذاب سے بچا لیا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں مفہوم یہ ہے کہ ان کی کارستانیاں اور مخالفتِ حق اب اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ انہیں تباہ کر دینا ہی عین انصاف ہے لہٰذا انہیں ایمان کی

توفیق ہی نہ ملے اور یہ اپنے کیے کا مزہ چکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی یہی تھی اس لیے فرعون اور اس کے سرداروں کا مال بھی برباد ہوا کہ ان کے کسی کام نہ آیا اور ان کے دلوں پر بھی ایسی مہر لگی کہ بس راندگانِ درگاہ کی اولیں صفوں میں دھکیل دیئے گئے۔ غرقِ آب کے موقع پر فرعون اور اس کے ساتھیوں نے ایمان کا اقرار بھی کیا مگر اب تو عذابِ عام آچکا تھا، یہ ایمان ان کے کسی کام نہ آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ان کی آنکھوں کے سامنے پوری ہو گئی۔ انہوں نے وہ منظر دیکھا کہ جب شان و شوکت اور زینت و احوال والے پانی میں غوطے کھا رہے تھے اور "آمنا، آمنا" کی صدائیں لگا رہے تھے مگر اب پچھتائے کیا ہووت:۔

"فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ ۔" (نہ آسمان نے ان پر آنسو بہائے، نہ زمین ان پر روئی اور نہ ہی انہیں (مزید) مہلت دی گئی۔)

۳۶

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۚ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

(ہود، آیت: ۴۱)

"اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی، میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔"

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا ہے جو آپ نے اپنی کشتی پر سوار ہوتے وقت مانگی تھی حضرت نوحؑ نے ساڑھے نو سو سال فریضۂ تبلیغ سرانجام دیا مگر بہت کم لوگ آپ پر ایمان لائے۔ سردارانِ قوم آپ کے سخت خلاف تھے۔ آپ کی بات جن تھوڑے سے لوگوں نے مانی، وہ بھی کمزور اور غریب لوگ تھے۔ آپ خود اللہ تعالیٰ سے شکایت کرتے ہیں تو کہتے ہیں:

"رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ○ نوح ۲۱

(اے مالک ان لوگوں نے میری نافرمانی کی ہے اور مانا صرف چند ان لوگوں نے جو مال اور اولاد کے لحاظ سے کمزور ہیں) سردارانِ قوم آپ کا مذاق اڑاتے ہوئے بھی بار بار یہ کہتے تھے کہ اے نوح تیری

پیروی تو کمینے لوگ (نعوذ باللہ) کر رہے ہیں، ہم تجھے کیسے نبی مان لیں (وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ)

ساڑھے نو سو سال تک اس قوم میں رہنے کے بعد حضرت نوحؑ کو معلوم ہو گیا کہ اب مزید کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی۔ آنجنابؑ نے قوم کے بدکردار وفاسق اور منکرینِ حق لوگوں کے لیے تباہی کی دعا مانگی اور وہ قبول ہو گئی۔ اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ ان لوگوں کو طوفان میں غرق کر دیا جائے گا اور اس طوفان سے صرف اہلِ ایمان ہی بچ سکیں گے۔ اہلِ ایمان کے بچاؤ کے لیے حضرت نوح کو کشتی بنانے کا حکم ہوا۔ آپ نے کشتی بنانی شروع کر دی۔ لوگوں نے دیکھا تو آپ کا مذاق اڑایا کہ کشتی خشکی میں چلے گی کیسے؟ آپ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہے اور استہزا کرنے والوں سے صرف یہ کہتے رہے کہ اگر آج تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو کل تمہارا بھی مذاق اڑایا جائے گا۔

طوفان کی علامات اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو بتا دی تھیں جب وہ علامات ظاہر ہوئیں تو آپ اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کو لے کر کشتی میں سوار ہو گئے۔ جب پورا علاقہ گھرے پانی میں ڈوب رہا تھا اور اہلِ کفر غرقابی کے عذاب میں مبتلا تھے تو حضرت نوح اپنی کشتی میں بعافیت بیٹھے تھے۔ کشتی جب پانی کی لہروں پر چلنے لگی تو آپ نے یہ دعا پڑھی انہوں نے اپنی پوری کوشش اور ظاہری اسباب کی فراہمی کے بعد اب معاملہ اللہ کے ہاتھ میں دے دیا تھا کہ وہی کارسازِ حقیقی ہے۔ یہی مومن کی شان ہوتی ہے۔

یہ دعا بحری سفر کے لیے دعائے مسنونہ ہے۔

۴۷

رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝ (ہود آیت: ۴۵)

"اے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔"

یہ دعا حضرت نوح علیہ السلام کی ہے ۔ آپ نے یہ دعا اس وقت مانگی تھی جب آپ کی کشتی پانی کی موجوں کو چیرتی ہوئی جُودی پہاڑ کی جانب رواں تھی اور اس دوران میں آپ کا اپنا بیٹا کنعان آپ کے سامنے آیا ۔ آپ نے دیکھا کہ بیٹا پانی کے تھپیڑے کھا رہا ہے تو پکار کر کہا ۔ " میرے بیٹے ! ہمارے ساتھ اس کشتی میں سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ مت شامل ہو " بیٹے نے جواب دیا ۔ " میں تمہارے ساتھ تو نہیں آتا ، پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا ۔ " حضرت نوح نے فرمایا ۔ " لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ " (آج تو کوئی چیز بھی اللہ کے عذاب سے بچانیوالی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ خود ہی کسی پہ رحم فرمائے ۔) باپ بیٹے کی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک بلند موجِ آب آئی اور بیٹے کو بہا کر لے گئی جس کے بعد وہ پھر نہ ابھر سکا ۔

حضرت نوح اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے لیکن بہر حال وہ اس وقت باپ بھی تھے اور باپ کے نازک جذبات و احساسات سے مفر ممکن نہ تھا ۔ اچانک آپ کے ذہن پہ بیٹے کی غرقابی کا وہ دل فگار منظر چھا گیا اور آپ نے شدّتِ جذبات سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ " یا اللہ میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے ...... الخ " اللہ تعالیٰ نے نزولِ عذاب سے قبل حضرت نوح کو بتا دیا تھا کہ طوفان سے ان کے اہل اور مومنین کو محفوظ رکھا جائے گا لیکن اہل میں یہ بھی بتایا گیا ۔ " إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ " یعنی اہل میں سے وہ لوگ نہیں بچائے جائیں گے جن کی نشان دہی کی گئی ہے اور اس نشان دہی میں آپ کی ایک بیوی اور ایک بیٹا شامل تھے ۔

حضرت نوح کی اس دعا کا مفہوم یہی تھا کہ " یا اللہ تو نے تو میرے اہل کو بچانے کا وعدہ کیا تھا اور تیرا وعدہ بالکل حق سچ ہے ۔ پھر میرے بیٹے کو بھی بچا لو ۔ " اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو جن سخت الفاظ میں تنبیہہ کی ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک مکافاتِ عمل کی کتنی اہمیت ہے ۔ قرآن و حدیث میں اگرچہ بہت سے مقامات پر فلسفہ شفاعت کی وضاحت کی گئی ہے مگر یہ مقام بڑا ہی عبرت انگیز ہے ! اللہ کا ایک نبی جس نے اس کے دین کی خاطر دن رات ایک کر دیا ، خفیہ اور اعلانیہ دعوتِ حق کا فریضہ سر انجام دیا ۔ پتھر کھائے اور اُف نہ کی ، قوم کی گالیاں سنیں اور اعلانِ حق برابر کیے جاتا رہا ، اس نے جب ایک غیر مستحق کے

لیے اشاروں کنایوں میں شفاعت کی تو ربّ ذوالجلال کو گوارا نہ ہوا کہ اس شفاعت کو قبول کرلیں۔ نہ صرف یہ بلکہ پیغمبر کو سخت الفاظ میں تنبیہہ کی کہ وہ آئندہ اس قسم کا سوال بھی نہ کریں۔ جہاں معاملہ محض چند غلطیوں اور گناہوں کا ہو وہاں اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کی شفاعت قبول کرتا ہے لیکن جہاں معاملہ اصولوں اور اعتقادات و نظریات کا ہو وہاں منکرین حق کے بارے میں کوئی شفاعت مقبول نہیں ہوتی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی یہ دعا قبول نہیں کی گئی اور انہیں بتایا گیا کہ ان کا بیٹا اگرچہ ان کے صلب سے پیدا ہوا ہے مگر اس کو اہل میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ اس نے کفار کی راہ اختیار کی ہے۔ یہ واقعہ اسلامی اخوت کی بھی خوب وضاحت کرتا ہے۔ گوشت پوست اور خون کا تعلق عقیدے اور نظریے کے تعلق پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں دو ہی برادریاں ہیں ایک اہل اسلام کی خواہ وہ کسی نسل، رنگ، پیشے، علاقے، زبان اور زمان سے تعلق رکھتے ہوں اور دوسری اہل کفر کی خواہ وہ اپنے درمیان ہزاروں اختلاف رکھتے ہوں کیونکہ حقیقت میں وہ سب ایک ہیں اس لیے کہ سبھی اسلام کے دشمن ہیں۔

۳۸

رَبِّ إِنِّيٓ أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِۦ عِلْمٌ ۖ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِيٓ أَكُن مِّنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ۝ (ہود، آیت: ۴۷)

"اے میرے ربّ، میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔"

یہ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی دعا ہے اور تنبیہہ ربّانی کے بعد مانگی گئی ہے، دیکھیے اس دعا میں کتنی عاجزی اور فروتنی ہے۔ اللہ کی ناراضگی اللہ کے پیغمبر کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس خواہش پر جو پہلی دعا میں مذکور ہوئی ہے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو آپ سخت مضطرب ہو گئے، دل سے [illegible] ہونے کا [illegible] نکل گیا

اور آپ اللہ کے سامنے گڑگڑانے لگے۔ یہی انابت الی اللہ ہے اور یہی چیز ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کو حد درجہ عزیز ہے۔ مومن کی شان یہی بیان کی گئی ہے کہ جب اس سے کوئی کوتاہی ہو جائے یا وہ اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے تو اللہ کی یاد میں مصروف ہو جاتا ہے، گناہ کی سچے دل سے معافی مانگتا ہے اور اپنے آپ کو خدا کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے کہ وہ معافی کا دروازہ کھول دے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی شان یہ بیان کی ہے کہ اسے اپنے ان بندوں کو معاف کرنے میں یک گونہ مسرت و لذت حاصل ہوتی ہے۔

یہ دعا سن کر اللہ میاں نے حضرت نوح کو معاف فرما دیا اور اپنی طرف سے ان کو سلامتی اور برکت کی نوید سنائی۔

(۳۹)

وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِٱللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝ (ہود، آیت: ۸۸)

"میں اللہ کی توفیق کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔"

یہ سیدنا شعیب علیہ السلام کی دعا ہے۔ آپ کی ایک دعا سورۂ اعراف کی دعاؤں میں بیان ہو چکی ہے۔ آپ مدین میں نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ یہ ایک تاجر قوم تھی جس کے بگڑے ہوئے اطوار کی اصلاح آنجناب کے سپرد کی گئی۔ اس قوم میں تجارتی بددیانتیاں اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھیں۔ ناپ تول میں ڈنڈی مارنا ایک عام مشغلہ تھا۔ علاوہ ازیں قتل و خون اور فساد و ڈاکہ زنی بھی ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ حضرت شعیب نے جب ان کو برے کاموں سے اجتناب کی تلقین کی تو انہوں نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ وعظ و نصیحت کس لیے ہے۔ اس کا مقصد تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب ناپ تول میں منصف و محتاط ہو جائیں اور یہ اپنی من مانی کرتا رہے تاکہ سب سے بڑا مہاجن بن کر پورے بازار پر قابض ہو جائے۔

اس الزام کا جواب سن کر حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا:۔

" مَا أُرِيْدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلٰى مَا أَنْهٰكُمْ عَنْهُ ط إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط "
(میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے تم کو منع کرتا ہوں، خود ان کا ارتکاب کروں۔ میں اپنی استطاعت کے مطابق اصلاح چاہتا ہوں۔")

اس کے بعد آنجناب نے مذکورہ بالا دعائیہ فقرہ دھرایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اپنے مصلح ہونے پر کوئی غرور اور تکبر نہیں ہے کہ میں اس پر خود کو ہی سب کچھ سمجھوں اور پندار میں اکڑتا پھروں۔ نہیں بلکہ میرے رگ و پے میں یہ احساس موجزن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ یہ ہدایت جو مجھے ملی ہے اور جس کی طرف میں آپ لوگوں کو دعوت دے رہا ہوں یہ بھی تو خدا کا عطیہ ہے۔ باقی رہا تم لوگوں کی مخالفت اور ہٹ دھرمی کا معاملہ تو میں اس سے خائف ہو کر تبلیغ و اصلاح کا کام چھوڑ کر بیٹھ نہیں رہوں گا۔ مجھے مخالفتوں کے سیلاب سے مرعوب نہیں کیا جاسکتا کیونکہ میرا سہارا اتنا قوی اور مضبوط ہے جس کے سامنے کسی کا کوئی بس نہیں چل سکتا۔ میں نے اللہ جل شانہ پر بھروسہ کیا ہے اور ہر معاملہ میں میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ہر کام کا آغاز کرنے سے پہلے اور ہر منزل کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ حائل ہوجانے کے موقع پر مذکورہ بالا دعائیہ فقرات دہرانے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کام کو بخیر و خوبی اختتام تک پہنچائے گا اور اپنی نصرت سے ہر رکاوٹ کو دور فرما کر راستے کھول دے گا۔

(۴۰)

مَعَاذَ اللّٰہِ (یوسف، آیت: ۲۳)

" خدایا تیری پناہ "

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا ہے۔ یہ بڑی مختصر مگر نہایت جامع دعا ہے۔ جب آپ، مصر کے بازاروں میں فروخت ہوتے ہوئے عزیز مصر کے گھر پہنچے تو عزیز مصر نے آپ کے چہرے سے ہی دیکھ لیا کہ آپ کوئی معمولی انسان نہیں ہیں۔ آپ کو ایک نظر ہی دیکھ کر جہاندیدہ

آدمی سمجھ سکتا تھا کہ آپ کسی اونچے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ عزیز مصر نے آپ کی بڑی عزت کی اور اپنی بیوی سے بھی کہا کہ وہ انہیں معمولی ملازم نہ سمجھے بلکہ اپنا عزیز سمجھ کر ان سے اچھا سلوک کرے۔

حضرت یوسف کچھ عرصہ اس گھر میں رہے تو گھر والی جو مصر کے آزاد منش بگڑے ہوئے معاشرے کی ایک نہایت ماڈرن عورت تھی آپ پر ریجھ گئی۔ اٹھارہ بیس سال کا ایک چاند سا لڑکا جس کے حسن و جمال کی مثال ملنی ناممکن تھی، اس عورت کے دل کو بس ایسا بھایا کہ اس نے ہر حیلے بہانے سے اسے پھانسنے کی کوشش کی۔ حضرت یوسف جو اللہ کے پیغمبر ہی نہیں تھے بلکہ خاندانِ نبوّت کے چشم و چراغ تھے[1] اس کیفیت کو سمجھ گئے اور اس سے بچنے کے لیے ہوشیار ہو گئے۔

یہ ایک کشمکش تھی جو اس منہ زور عورت اور اس غریب الدیار نوجوان کے درمیان چل رہی تھی۔ وہ برائی کی دعوت دیتی تھی اور اس کے لیے کئی جال بھی اس نے بچھا رکھے تھے اور یہ برائی سے دامن بچاتے تھے اور اپنی پاک دامنی کے تحفظ کے لیے ہر وقت فکرمند رہتے تھے۔ آخر ایک دن اس عورت نے گھر کے تمام دروازے بند کر دیئے اور برائی کا دروازہ کھولتے ہوئے حضرت یوسف سے کہا۔ "آجایئے"۔ یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ شیطان کا حملہ بڑا سخت اور مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس حملے کے مقابلے پر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی پناہ میں دے دیا۔

آپ کے یہ مختصر سے الفاظ نہایت بے ساختگی سے آپ کی زبان سے نکلے۔ آپ نے محسوس کیا کہ آپ کی عزت و عفت سخت خطرے میں ہے۔ آپ بہت مضطرب ہو گئے۔ آپ کے اندر بھی جذبات و احساسات رجولیت موجود تھے مگر آپ کو اللہ تعالیٰ نے فوراً یہ بات سمجھا دی کہ اس نازک موقع پر سوائے اللہ کی مدد اور پناہ کے اور کوئی ذریعہ تحفظ نہیں ہے۔

---

[1] حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ "سب سے بہتر انسان کون ہے؟" آپ نے جواب دیا۔ "جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے"۔ صحابہؓ نے کہا۔ "ہم یہ نہیں پوچھتے"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "تاریخ انسانی میں سب سے باعزت مقام یوسف علیہ السلام کا ہے جو رسول ابن رسول ابن رسول ابن رسول تھے"۔ صحابہ نے کہا "ہم یہ بھی نہیں پوچھتے"۔ آپ نے کہا۔ "اچھا تم جو کچھ پوچھتے ہو اس کا جواب یہ ہے کہ جو جاہلیت کی زندگی میں اچھا تھا وہ اسلام لایا تو اسلام میں بھی وہی بہتر ثابت ہوا"۔

آپ نے جب اللہ کی پناہ مانگی تو اللہ نے آپ کی مدد کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو برہان دکھائی اور وہ برہان یہ تھی کہ آپ کا ضمیر روشن پکار اٹھا۔ " اے یوسف تجھے ہرگز زیبا نہیں ہے کہ ایک عورت کے بہکا دیے میں آکر اپنے مالک حقیقی کی حدوں کو توڑ جائے۔ وہ تجھ پر حد سے زیادہ مہربانیاں کرتا جا رہا ہے تو کیا تو اس کے احکام کی پابندی نہیں کرے گا؟" دل سے اس آواز کا اٹھنا تھا کہ آپ دروازے کی سمت دوڑے۔ عورت نے آپ کے پیچھے بھاگ کر پکڑ لینا چاہا اور آپ کا قمیص پکڑ بھی لیا جو پھٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام کو شیطان کے اس حملے سے محفوظ رکھا بلکہ آپ کی پاکدامنی کے لیے شواہد بھی مہیا کر دیئے۔ اتفاق سے جب دونوں دروازے تک بھاگتے ہوئے آئے تو عزیز مصر کو دروازے کے باہر موجود پایا۔ مکار عورت بجائے نادم ہونے کے فوراً پکار اٹھی " اس لڑکے نے آپ کے اہل پر دست درازی کرنے کی کوشش کی ہے۔" حضرت یوسف نے صحیح صورت حال بتائی کہ " دراصل اس عورت نے مجھے بہکانے کی کوشش کی ہے۔" قرائن سے صحیح نتیجے پر پہنچنے والے کسی صاحب بصیرت نے کہا۔ " اگر لڑکے کا کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہے تو جارحیت لڑکے کی تھی اور عورت کی طرف سے دفاع تھا اور اگر کرتا پیچھے کی جانب سے پھٹا ہوا ہے تو عورت نے جارحیت کی ہے اور لڑکے نے بھاگ کر اپنی عزت بچائی ہے۔" کرتا دیکھا گیا تو پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔ صاحب خانہ نے یہ صورت حال دیکھ کر حضرت یوسف سے معذرت کے انداز میں کہا۔ " يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا " (یوسف، اس معاملے سے درگزر کر۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کو اپنے ساتھ بیتنے والے اس واقعہ کا سخت افسوس تھا اور آپ اپنے کو غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے۔) پھر صاحب خانہ نہایت نرمی سے اور بغیر کسی مظاہرۂ غیرت کے اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ " اے عورت تو معافی مانگ، گناہ تیرا ہی تھا۔"

جب بھی کبھی کسی مسلم مخلص کے ساتھ اس قسم کا معاملہ پیش آجائے تو اسے فوراً شیطان کی چال سے ہوشیار ہو جانا چاہیے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو یاد کرے اور اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھ کر وہی الفاظ دہرائے جو اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ السلام نے کہے تھے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے برائی ٹال دے گا۔ اے اللہ ہمیں ہر برائی سے محفوظ رکھ اور شیطان کے حملوں

سے ہمیں اپنی پناہ میں لے لے ۔

(۴۱)

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ (یوسف آیت ۳۳)

"اے میرے رب، قید مجھے اس کام سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ لوگ مجھے دعوت دیتے ہیں اور تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔"

یہ دعا بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے۔ عزیز کی بیوی نے آپ کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کی شہرت طول و عرض ملک میں پھیل گئی۔ دارالحکومت کے اونچے طبقوں کی خواتین نے تو اس واقعہ کو موضوعِ سخن بنا لیا۔ محفل ہائے طرب و نشاط میں ہر "بیری" کی زبان سے یہی بات نکلتی کہ "عزیز کی بیوی تو اپنے غلام پر مرمٹی ہے۔" ادھر حضرت یوسف علیہ السلام اگرچہ الزامِ زنا سے بری ہو چکے تھے لیکن خطرات ابھی ٹلے نہیں تھے کیونکہ منہ زور عورت نے تا حال آپ کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

شہر میں جب زلیخا کا واقعہ عام لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا عین اس وقت زلیخا نے اونچے طبقوں کی خواتین کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ ان سب کے سامنے پھل اور چھریاں رکھ کر اچانک حضرت یوسف کو ان کے سامنے نکال کھڑا کیا۔ اس ماہِ حسن و جمال کو ایک آنکھ دیکھتے ہی تمام زنانِ مصر بیخود ہو گئیں۔ حیرانی و پریشانی کے عالم میں بجائے پھل کاٹنے کے اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور پکار اٹھیں کہ "حاشا للہ، یہ شخص انسان کہاں ہو سکتا ہے۔ یہ تو معزز فرشتہ ہے۔" زلیخا نے اس موقع پر اپنے جذباتِ محبت کے حق میں فضا ساز گار پائی تو ان طعنہ دینے والی خواتین پر خوب برسی اور کہنے لگی۔ "یہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔ میں نے اسے کافی رجھانے کی کوشش کی مگر یہ بچ نکلا۔ اگر اس نے میرا کہا نہ مانا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا۔"

یہ حالات تھے جن حالات میں حضرت یوسف علیہ السلام قید کو ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح یہ معلوم تھا کہ قید چلے جانا کوئی ذلت و خواری نہیں ہے لیکن زلیخا کی دعوت پر خدا

کے احکام سے روگردانی بہت بڑی پستی ہے۔ پس آپ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ انہیں جیل بھجوا دیا جائے مگر اس گندگی سے ہر حال میں بچا لیا جائے جس کی طرف نہ صرف زلیخا بلکہ مصر کی تمام خوب صورت و پری چہرہ عورتیں دعوت دے رہی تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول کر لی اور آپ کو اس گناہ عظیم سے محفوظ رکھنے کے لیے قید میں ڈال دیا۔ یہ قید میں ڈالا جانا صرف اس گناہ سے بچانے کے لیے نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے بڑی بڑی عظیم الشان حکمتیں کارفرما تھیں۔ ایک تو یہی کہ حضرت یوسف کو قید میں غور و فکر کا خوب موقع ملے دوسرے یہ کہ ان کے اخلاق و کردار کی مضبوطی زنان مصر پر واضح ہو جائے تاکہ وہ ان کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہ رہیں۔ تیسرے یہ کہ حکومت تک پہنچنے کے لیے ان کا راستہ صاف ہو اور وہ یوں کہ قید خانے میں آپ کی نیک نامی و علمی منزلت کا شہرہ اس قدر پھیل گیا کہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر کے لیے ایک سابق قیدی نے آپ کا نام پیش کیا۔ جب تعبیر آپ نے بتائی تو بادشاہ کو بہت بھائی، آپ کو بلایا گیا اور آپ اپنی اخلاقی پاکیزگی کے حق میں زنان مصر سے بادشاہ کے روبرو گواہی دلوانے کے بعد جیل خانے سے نکلے تو بادشاہ نے خزائنِ ارض آپ کے حوالے کر دیئے۔

(۴۲)

فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○ (یوسف آیت: ۶۴)

"پس اللہ ہی بہترین محافظ ہے اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

یہ دعا حضرت یعقوب علیہ السلام کی ہے۔ ان الفاظ میں اگرچہ باقاعدہ کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا گیا لیکن مفہوم دعا پر دلالت کرتا ہے اس لیے اس فقرے کو ہم نے دعاؤں میں شامل کیا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ان الفاظ کے ذریعے اپنے بیٹوں کو اللہ کی حفاظت میں دے رہے ہیں اور اس یقین کے ساتھ کہ نہ تو کوئی محافظ اس محافظِ حقیقی سے اچھی حفاظت کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس سے زیادہ رحیم ہو سکتا ہے۔ یہ دعا اس وقت مانگی گئی تھی جبکہ آنجناب نے اپنے دس بیٹوں کے ساتھ گیارہویں فرزند بن یمین کو مصر کے سفر کی اجازت دی تھی۔ مصر میں حضرت

یوسف علیہ السلام کی حکومت تھی اور مصر اور قربِ جوار کے تمام علاقے سخت قحط سالی میں مبتلا تھے۔ برادرانِ یوسف غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر گئے۔ مصر میں حضرت یوسف نے اس سات سالہ طویل قحط کی پیش بندی کر رکھی تھی اور وافر مقدار میں غلہ سرکاری گوداموں میں محفوظ تھا[1]۔ حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کو پہچان لیا مگر وہ انہیں نہ پہچان سکے۔ فرزندانِ یعقوب نے اپنا اپنا غلہ حاصل کرنے کے بعد مطالبہ کیا کہ انہیں ان کے نابینا بوڑھے باپ اور چھوٹے بھائی کے کوٹے کا غلہ بھی دیا جائے۔ چونکہ قحط سالی تھی اس لیے غلے کی راشن بندی کر دی گئی تھی۔ حضرت یوسف نے کہا کہ تم اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ کیوں نہیں لائے جبکہ غلے کے حصول کے لیے ہر آدمی کو خود حاضر ہونا چاہیئے۔ (باپ کے بارے میں تو یہ عذرِ معقول موجود تھا کہ وہ بوڑھے اور نابینا ہیں) حضرت یوسف نے حکم دیا کہ آئندہ اگر وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر نہ آئے تو انہیں بالکل غلہ نہیں دیا جائے گا۔

مصر سے غلہ لے کر فرزندانِ یعقوب علیہ السلام کنعان پہنچے تو انہوں نے اپنے والد کے سامنے ساری صورت حال رکھ دی۔ انہوں نے بتایا کہ عزیز مصر نے آئندہ غلہ دینے کے لیے یہ لازمی شرط رکھی ہے کہ بن یمین کو اس کے سامنے پیش کر کے ثابت کیا جائے کہ جس گیارہویں بھائی کا غلہ ہم نے حاصل کیا ہے وہ واقعی موجود ہے اور ہم نے کوئی فراڈ نہیں کیا۔ پھر انہوں نے زور لگانا شروع کیا کہ بن یمین کو ضرور ان کے ساتھ بھیجا جائے اور یہ کہ وہ اس کے محافظ

---

[1] جیل خانے میں جب بادشاہ مصر کے خواب کی تعبیر آپ سے پوچھی گئی تھی تو آپ نے بتایا تھا کہ سات سال تک خوب بارش ہوگی زمین بھی پیداوار سے اہل ملک کو مالا مال کر دے گی۔ لیکن اس کے بعد سات سال کا ایک طویل قحط رونما ہوگا جس کے دوران نہ بارش ہوگی نہ زمین سے کچھ پیدا ہوگا۔ اس تعبیر کے ساتھ ہی آپ نے منصوبہ بتا دیا کہ خوشحالی کے سات سالوں میں فصلوں کی بالیوں کو گاہنے کی بجائے جوں کا توں محفوظ رکھ لیا جائے اور صرف بقدرِ ضرورت گاہ کر غلہ استعمال میں لایا جائے۔ اس تعبیر کے سنتے ہی بادشاہ نے آپ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس کی تفصیلات سورۂ یوسف میں موجود ہیں۔ ازاں بعد اللہ تعالیٰ نے خزائنِ ارض آپ کے سپرد کر دیئے اور آپ ملکِ مصر میں سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔

ہوں گے۔

حضرت یعقوب کے سامنے جب ان کے بیٹوں نے یہ کہا کہ "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" تو آپ نے فوراً جواب میں کہا۔ "کیا میں اسے بھی تمہارے سپرد کر دوں، جس طرح اس سے قبل اس کے بھائی کو تمہارے حوالے کر دیا تھا (نہیں بلکہ) فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ" (میں اسے خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ وہی سب سے بہترین محافظ ہے اور وہی سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے)

دنیا میں دو طرح کے اسباب ہوتے ہیں، ظاہری اور باطنی۔ ان ہر دو کی مدد سے اپنی حفاظت کا اہتمام اسلام نے ضروری قرار دیا ہے۔ حضرت یعقوب نے باطنی اسباب مہیّا کرنے کے لیے تو قدرتِ حق کا دروازہ کھٹکھٹا دیا تھا لیکن اُسی صاحب دروازہ کا یہ حکم بھی تھا کہ ظاہری اسباب سے غفلت نہ برتی جائے۔ چنانچہ آپ مذکورہ الفاظ کہنے کے بعد اپنے بیٹوں سے عہد لیتے ہیں، کہ وہ بن یمین کی ہر طرح سے حفاظت کریں گے اِلّا یہ کہ کوئی ایسی منزل آجائے کہ جہاں وہ خود بھی گھیرے میں لے لیے جائیں۔ بیٹوں نے یہ عہد باندھ لیا تو باپ نے کہا۔ " وَاللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْلٌ " (ہم نے جو کچھ کہا ہے خدا اس پر وکیل ہے)

ظاہری اسباب مہیّا کرنے کے بعد انسان کو اپنا سارا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہیئے کہ وہ بہترین محافظ ہے یعنی ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حساب کم و بیش را

جان کا معاملہ ہو یا مال کا، گھر کی حفاظت ہو یا باہر کی، دین کی سپردگی ہو یا دنیا کی ہر معاملہ میں خدا ہی کو اپنی آخری پناہ گاہ سمجھنا چاہیئے اور اس پر مکمل بھروسہ رکھ کر اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے انشاء اللہ نقصان اور خسارہ کبھی نہیں ہوگا۔

؎ سپردم ترا بالیقین — ہمہ کارِ دنیا ہمہ کارِ دین

(۴۳)

اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ۝ (یوسف، آیت: ۸۶)

"میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا۔"

یہ الفاظ بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے ہیں۔ آپ کے فرزند مصر میں جب دوسری مرتبہ غلہ حاصل کرنے کے لیے گئے اور بن یمین کو بھی ساتھ لے گئے تو حضرت یوسف نے بن یمین کو اپنے پاس بلایا اور اسے بتا دیا کہ آپ حضرت یوسف ہیں۔ اس کے بعد آپ نے بھائی کو بتایا کہ غلہ ناپنے کا پیمانہ اس کی بوری میں رکھ دیا جائے گا اور پھر پیچھے سے اس پیمانے کی تلاش میں شاہی ملازمین قافلے کو جا روکیں گے۔ قافلہ روانہ ہو گیا، پیمانہ بن یمین کی خرجی میں ڈال دیا گیا تھا۔ قافلے کے تھوڑی دور جانے کے بعد ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ "اہلِ قافلہ رُک جاؤ، تم شاہی پیمانہ چوری کر کے لے آئے ہو۔" انہوں نے فوراً جواب دیا "تم جانتے ہو کہ ہم نہ تو فساد پھیلانے والے ہیں اور نہ ہی چور ہیں۔" شاہی ملازمین نے کہا "فرض کرو تم میں سے کسی کے پاس وہ پیمانہ مل جائے تو پھر؟" بنو یعقوب نے جواب دیا۔ "جس کے پاس مل جائے اسے سزا کے طور پر محبوس کر لیا جائے اور باقی لوگوں کو جانے کی اجازت دی جائے۔" چنانچہ سب کی خرجیوں کی تلاشی لی گئی مگر کسی میں سے پیمانہ برآمد نہ ہوا۔ آخر میں بن یمین کی خرجی کھولی گئی تو اس میں سے پیمانہ نکل آیا۔

پیمانہ برآمد ہونے پر برادران بن یمین کو بن یمین پر سخت غصہ آیا اور انہوں نے کہا کہ "اس نے چوری کی ہے اور اس کا بھائی (یوسف) بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے۔" اس کے ساتھ ہی انہیں سخت پریشانی بھی تھی کہ باپ کے ساتھ وہ پختہ عہد کر کے آئے تھے کہ بن یمین کی پوری طرح حفاظت کریں گے۔ انہوں نے عزیزِ مصر (یوسف علیہ السلام) سے کہا کہ "اس نوجوان کو چھوڑ دو اور اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو پکڑ لو۔" مگر حضرت یوسف نے جواب دیا۔ "ہم تو اسی کو پکڑیں گے جس کے پاس سے ہمارا مال برآمد ہوا ہے ورنہ تو ہم ظالموں میں شمار ہوں گے۔"

جب انہیں عزیزِ مصر سے بالکل مایوسی ہو گئی تو بڑا بھائی اسی جگہ رکا رہا اور اعلان کیا کہ وہ بن یمین کی رہائی تک اس زمین سے نہیں ٹلے گا۔ یا تو وہ مر جائے گا اور یا والد محترم اسے گھر آنے کی اجازت دیں گے۔ باقی بھائی اپنا سامان لے کر کنعان چلے گئے۔

گھر پہنچ کر انہوں نے حضرت یعقوب کو بتایا کہ بن یمین نے چوری کرلی تھی اور بادشاہ نے اسے محبوس کر لیا ہے۔ یہ موقع بڑا ہی دردناک تھا۔ یوسف کی جدائی کا صدمہ اب تک نہ بھولا تھا، اب بن یمین کی غربت میں قید اس پر مستزاد تھی۔ حضرت یعقوب کو سخت دکھ پہنچا مگر آپ نے فرمایا "تمہارے نفس نے دراصل ایک اور بڑے معاملے کو تمہارے لیے سہل بنا دیا ہے! اچھا میں اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ سے لا ملائے"! اس کے بعد حضرت یعقوب نے ایک طرف منہ موڑ لیا اور نہایت افسوس سے کہا "ہائے یوسف"۔ بیٹوں نے کہا: "خدارا آپ تو بس یوسف ہی کو یاد کیے جاتے ہیں۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے"۔

یہ موقع بڑا ہی نازک اور درد انگیز تھا۔ حضرت یعقوب نے اس موقع پر مندرجہ بالا الفاظ کہے۔ مومن کی یہی شان ہے کہ وہ ہر مصیبت کے وقت اللہ ہی کے سامنے گریہ کرتا ہے۔ حضرت یعقوب جن کی جسمانی قوتیں کمزور ہو چکی تھیں اور جن کے قلب و جگر پر ہجر یوسف و فراق بن یمین کے آرے چل رہے تھے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اپنی کمزوری اور غم کی شکایت اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں[۱]۔ اس کے فوراً بعد وہ اپنے بیٹوں سے کہتے ہیں کہ "مایوسی تو کافروں کا حصہ ہے۔ جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کرو"۔ گویا کہ حالات خواہ کتنے ہی دل شکن ہوں اللہ کے بندوں کو اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

---

[۱] حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سفر طائف کے بعد جب زخمی حالت میں زید بن حارثہؓ کے ساتھ شہر سے باہر نکلے اور جنگل میں رات آگئی تو رات کو آپ نے ایک طویل دعا فرمائی جس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے۔

"اللھم الیک اشکو بثی وحزنی وضعف قوتی وقلۃ حیلتی وھوانی علی الناس ..... الخ

(اے میرے مولا! میں اپنی پریشانی اور اپنے غم، اپنی طاقت کی کمزوری اور اپنے وسائل کی کمی اور لوگوں کے مقابلے پر اپنی کم مائگی کی شکایت تیرے سامنے پیش کرتا ہوں۔

(۴۴)

يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ز وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ (یوسف، آیت: ۹۲)

"اللہ تمہیں معاف کرے۔ وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔"

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا ہے۔ برادران یوسف علیہ السلام جب حضرت یوسف کو پہچان گئے تو سخت نادم ہوئے۔ وہ بھائی جسے انہوں نے کنوئیں میں پھینک دیا تھا، ان کے سامنے تخت مصر پر متمکن تھا اور یہ سب اس کے سامنے مفلس و قلاش، کمزور و لاچار کھڑے تھے۔ انہوں نے جب اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا تو ان کے دل میں خیال آیا کہ نہ معلوم آج شاہِ مصر یوسف ان کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے مگر پیغمبرِ خدا نے بے ساختہ کہہ دیا۔ "لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ" (آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا) اس کے بعد ان کی خطاؤں کی معافی کے لیے خود ہی ہاتھ اٹھا دیئے اور یہ دعا مانگی۔

حضور نبی کریم علیہ السلام کے ساتھ بھی ان کے بھائی بندوں نے برادرانِ یوسف کی طرح بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سختی کی۔ آپ کو مکہ سے نکالا گیا، قتل کے منصوبے بنائے گئے، بار بار آپ پر حملے ہوئے اور کئی مرتبہ آپ سے عہد کر کے توڑے گئے۔ آپ جب ان ساری منازل سے گزرنے کے بعد مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو چشمِ فلک نے سرزمینِ مصر کا وہ منظر ایک مرتبہ پھر دیکھ لیا۔ مکہ کے سرکش رئیس سر جھکائے کھڑے تھے اور رحمۃ اللعالمین شاہانہ انداز میں ان کے شہر کو فتح کر کے ان کے سامنے جلوہ افروز تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا "بتاؤ تمہیں مجھ سے کس قسم کے سلوک کی توقع ہے؟" سب نے بیک زبان کہا "اَخٌ كَرِيْمٌ وَابْنُ اَخٍ كَرِيْمٍ" (آپ نیک خو بھائی اور پاک طینت بھتیجے ہیں) آپ نے فرمایا۔ "میں تم سے وہی کچھ کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ آج تم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

(۷۵)

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قف اَنْتَ وَلِيّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ج تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ○ (یوسف، آیت: ۱۰۱)

"زمین و آسمان کے بنانے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں سرپرست ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجامِ کار مجھے صالحین کے ساتھ شامل کر۔"

یہ دعا حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے۔ بھائیوں کے سامنے اپنے آپ کا اظہار کرنے اور ان کی خطاؤں کو معاف کر دینے کے بعد آپ نے اپنے والدین اور تمام افرادِ خاندان کو مصر بلا لیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی زائل ہو چکی تھی۔ آپ نے اپنا کرتہ بھیجا جو ان کی آنکھوں پر رکھا گیا تو ان کی بینائی عود کر آئی۔ حضرت یعقوب اپنے تمام خاندان کے ہمراہ مصر گئے۔ حضرت یوسف نے اپنے اعیان اور عوام کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کا شہر سے باہر نکل کر زبردست استقبال کیا اور دارالحکومت پہنچ کر اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا۔ یہ موقع بڑی خوشی و مسرت کا متقاضی تھا۔ مدتوں کے بچھڑے ہوئے باپ بیٹے ایک دوسرے سے ملے اور اس حال میں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا مقام انہیں میسر تھا۔ (دنیا میں سب سے بڑا اعزاز۔ نبوت۔ پہلے ہی انہیں مرحمت فرما دیا گیا تھا) اس موقع پر حضرت یوسف ایک سچے مومن کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ مومن خواہ عروج کے کس مقام پر پہنچ جائے وہ اپنی حیثیتِ عبودیت سے غافل نہیں ہوتا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر بلندی اسے عجز و انکساری کا نیا سبق دے جاتی ہے۔ حضرت یوسف اس علوِ مرتبت کے موقع پر بارگاہِ ربانی میں کہتے ہیں "اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بخشی ہے اور مجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا ہے۔ زمین و آسمان کے بنانے والے تو ہی دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے۔ میرا خاتمہ اسلام پر کر اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔"

(۷۶)

هُوَ رَبِّیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ مَتَابِ ○ (الرعد، آیت: ۳۰)

"وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے۔"

یہ دُعا اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سکھائی ہے۔ آپ نے جب مکہ معظمہ میں قرآن مجید کا پیغام لوگوں کے سامنے پیش فرمایا تو کفار نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا انہوں نے حق کو نہ ماننے کی تو قسم کھا ہی رکھی تھی لیکن اپنے انکارِ حق کے لیے وہ طرح طرح کے بہانے ڈھونڈھ کر لے آتے تھے تاکہ اپنے انکار کا جواز پیش کر سکیں۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا نبی ہے تو اس کے اوپر کوئی نشانی کیوں نہ نازل ہوئی، اس کے ساتھ تو فرشتے آسمان سے اترنے چاہئیں تھے۔ یا اس کے سرسبز باغات اور پانی سے بھرے ہوئے چشمے ہوتے، یا وہ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاتا اور وہاں سے ایک کتاب ہمارے دیکھتے ہی اتار لاتا، یا وہ خدا سے ہماری ڈائریکٹ بات چیت کرا دیتا۔ غرض کہ ان کے بے شمار اس قسم کے بے ہودہ مطالبات تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ "ہم نے آپ کو اس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے تاکہ تم انہیں قرآن مجید سنا دو اور یہ تو اپنے ربّ کا انکار کیے ہوئے ہیں۔" پھر آگے یہ ہدایت کی کہ "اچھا اگر یہ انکار کرتے ہیں تو تمہیں کیا پروا ہے۔ تمہارا رب ہی تمہارے لیے بس ہے۔"

مومن کا سہارا اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے۔ وہ اس کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں رکھتا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ملجا و ماویٰ وہی ہستی ہے جس کے قبضۂ قدرت میں پوری کائنات ہے۔ یہ ایک بہت بڑا انقلابی نقطۂ نظر ہے۔ جس کے دل میں خدا کا خوف اور اسی پر بھروسہ کرنے کا عزم پیدا ہو جائے پھر اس کے دل میں کسی دوسرے شخص یا قوت کا خوف اور کسی کے سہارے زندہ رہنے کی تمنا کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

(۴۷)

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝

(ابراہیم آیت، ۳۵)

" پروردگار، اس شہر کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔

یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ معظمہ کی آبادکاری کے موقع پر مانگی تھی۔ آپ نے مکہ کو امن کی جگہ اور سکون کا گھر بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی۔ اس کا تذکرہ سورۂ بقرہ کی دعاؤں میں آچکا ہے۔ یہاں اس دعا میں یہ اضافہ ہے کہ بتوں کی پوجا سے آپ اپنی ذات اور اپنی اولاد کے حق میں خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ بُت محض مٹی اور پتھر کی مورتیاں ہی نہیں ہوتیں، بلکہ ہر وہ چیز جس کو معبودِ حقیقی کے بجائے صاحبِ اختیار اور منبعِ حکم مان لیا جائے وہی بت بن جاتا ہے۔ یہ بُت انسان کا اپنا نفس بھی ہو سکتا ہے جس کی ہر خواہش خدا کے احکام سے سرتابی پر مشتمل ہوتی ہے اور جس کے پیچھے چلنے سے انسان حدود اللہ سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ یہ بت دنیا کے رسوم و رواج بھی ہو سکتے ہیں جن کے پیچھے چل کر انسان حق کا راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بت خاندان اور قبیلہ، دوست اور احباب، خودسر حکمران اور شیطانِ ملعون بھی ہو سکتا ہے جن کا کام طاغوتی نظام کی پشت پناہی اور احکامِ الٰہیہ سے روگردانی ہے۔ یہ تمام مختلف قسم کے بُت ہیں۔

حضرت ابراہیم ان سب بتوں سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ آپ اس سے آگے کہتے ہیں کہ " رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ج " (الٰہی ان بتوں نے بے شمار لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کیا ہے۔) گویا کہ حضرت ابراہیم ان جملہ اصنام کی گمراہی کا مداوا چاہتے ہیں۔ آپ کی اس دعا کے باوجود آپ کی اولاد میں بہت بڑی تعداد بت پرستی کا شکار ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دعا کی قبولیت میں تو شک نہیں لیکن انسانوں کو فکر و عمل کی آزادی اور اختیار و ارادہ کی چھوٹی چھوٹ دی گئی ہے اس کے نتیجے میں کچھ لوگ آزمائش میں پورے اترتے ہیں اور کچھ ناکام ہو جاتے ہیں۔ اپنی حیثیت کو پہچان لینے والوں کے لیے تو یہ دعا ڈھال ہے کہ ان کے راستے میں اگر کبھی اصنام آئے بھی تو خدا نے انہیں بچا لیا۔ رہے شترِ بے مہار لوگ تو انہوں نے خود ہی اپنے حق میں اس ڈھال کو بے اثر بنا دیا ہے۔

۴۸

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ○ (ابراہیم، آیت: ۳۷)

"(اے پروردگار) تو لوگوں کے دلوں کو ان (اہلِ مکہ) کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے، شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔"

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اہلِ مکہ کے لیے دعا مانگی تھی۔ اس دعا سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ "پروردگار میں نے تیرے گھر کے جوار میں اس وادئ بے آب و گیاہ کے اندر اپنی اولاد کو لا بسایا ہے۔ اے مولا! میں نے یہ اس لیے کیا ہے تاکہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔" اب وہ غیر آباد وادی اور اس میں خدا کا خانہ محترم۔ پھر اولادِ ابراہیم کی آبادی اور ان کی ضروریات زندگی۔ حضرت ابراہیمؑ کو خیال آیا کہ ایک تو دنیا کے لوگوں کو اس خانۂ خدا کی جانب ذوق و شوق سے آنا چاہیے تاکہ اس میں رونق اور آبادی نظر آئے دوسرے یہاں کے باشندگان کو رزق اور پھل کثرت سے ملنے چاہئیں تاکہ ان کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہ ہو کہ وہ اس وادئ غیر ذی زرع میں بھوکوں مر جائیں گے۔

حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کا اثر ہے کہ اس روز سے آج تک دنیا کے ہر کونے سے بے شمار انسان دل کی گہرائیوں میں یہ تمنا لیے گھروں سے نکلتے ہیں کہ خانۂ خدا کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ یہ صورتِ حال قیامت تک قائم رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی دعائے ابراہیمؑ ہی کا اثر ہے کہ مکہ میں دنیا کا ہر پھل ہر زمانے میں وافر مقدار میں ملتا رہا ہے اور آج بھی ملتا ہے اور یہ صورت بھی انشاء اللہ روزِ حشر تک قائم رہے گی۔

اب پٹرول کی دولت نے مکہ اور اس کے قرب و جوار کو دنیا کا مالدار ترین خطہ بنا دیا ہے۔ یہ بھی دعائے ابراہیمی کا اثر ہے کہ صحرائے غیر آباد سے دولت کے ذخیرے دستیاب ہو گئے ہیں۔ زرخیز و آباد قطعہ ہائے زمین اب اس صحرائی دولت کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ اور روحانی دولت کے لحاظ سے تو بہر حال پہلے ہی اس خطہ کو وہ مقام حاصل تھا کہ جس کی برابری

کوئی قطعۂ ارض کبھی نہیں کر سکتا۔

(۴۹)

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ○
رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ○

(ابراہیم، سورت، ۴۰-۴۱)

"اے پروردگار، مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد کو بھی۔ پروردگار، میری دعا قبول کر۔ پروردگار، مجھے اور میرے والدین کو اور سب اہلِ ایمان کو معاف کر دیجیو جس روز حساب قائم ہو گا۔"

یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے اور اسے دعائے صلوٰۃ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ نمازیں یہی دعا بکثرت پڑھی جاتی ہے۔ اس دعا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے نماز کی پابندی اور اقامت کی توفیق اللہ تعالیٰ سے مانگی ہے۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس کی تاکید قرآن و حدیث میں بہت زیادہ آئی ہے۔ تمام انبیائے کرام نے نماز کے معاملے میں بہت سرگرمی اور پابندی کا عملی نمونہ ہمارے سامنے پیش فرمایا ہے۔ حضرت اسماعیل کے بارے میں سورۂ مریم میں آیا ہے۔ "كَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ" (وہ اپنے اہل و عیال کو نماز کی اقامت اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا کرتے ہیں۔) اسی سورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل ہوا ہے۔ "وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا" (مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ تا دمِ زیست نماز اور زکوٰۃ کا پابند رہوں) حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں سورۂ ہود میں آیا ہے کہ ان کی قوم ان کی کثرتِ صلوٰۃ کی وجہ سے انہیں بطور طعنہ کہتی تھی۔ "کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں"

حدیث شریف میں نماز کے بارے میں اس قدر روایات آئی ہیں کہ کتاب الصلوٰۃ کتب احادیث کا بہت بڑا حصہ بن گیا ہے۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن اور کافر کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا ہے۔ اس دعا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے بھی یہ دعا کی ہے کہ خدا تعالیٰ انہیں نماز قائم کرنے والا بنائے اور اپنی اولاد کے لیے بھی یہی دعا کی ہے۔

قرآن مجید میں حکم آیا ہے "قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا" (تحریم) یعنی تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو آگ سے بچاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل و عیال کی تربیت اس انداز سے کرنی چاہیئے کہ وہ آگ سے بچنے کے طریقے اختیار کر سکیں۔ پھر اس تربیت کے ساتھ خدا تعالیٰ سے بھی ان کے حق میں دُعائے خیر کرتے رہنا چاہیے۔ یہی چیز ہمیں دعائے ابراہیم میں نظر آ رہی ہے۔

قبولیت دعا کے لیے بھی اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کی جاتی ہے۔ وہ جب تک نہ چاہے کوئی دعا بھی اثر نہیں کرتی۔ دعا میں اثر پیدا کرنے کے لیے اس کے سامنے کہا جا رہا ہے کہ "خدایا میری دعا قبول فرما"۔ کیا شان ہے جد الانبیاء کی اس دعائے دل نشین کی۔

دعا کے دوسرے حصے میں حضرت ابراہیم مغفرت طلب کرتے ہیں۔ ان کی دعائے مغفرت (۱) اپنی ذات کے لیے (۲) اپنے والدین کے لیے (۳) جمیع اہل ایمان کے لیے ہے۔ وہ جب ہجرت کرتے اپنے وطن سے چلے جا رہے تھے تو ان کا والد ان لوگوں میں شامل تھا جو غرور کی طاغوتی طاقت کے سامنے سرنگوں تھے اور خالقِ برحق کے سچے نمائندے ابراہیم علیہ السلام کی جان کے دشمن تھے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے والد کو بہت سمجھایا کہ وہ راہِ راست پر آ جائے مگر وہ نہ مانا۔ آخر آپ نے "انی مہاجرٌ الی ربی" کا نعرہ لگایا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خدا کی راہ میں مہاجر بن گئے۔ جاتے ہوئے اپنے والد سے کہہ دیا تھا۔ "سَاَسْتَغْفِرُلَكَ رَبِّیْ" (ابا جی میں آپ کی ضد اور انکار کے باوجود اپنے رب سے آپ کے لیے دُعائے مغفرت کروں گا۔) اسی قول کے پیشِ نظر آپ نے یہ دعا مانگی تو اپنے والدین کو اس میں شامل کر لیا۔ بعد میں جیسا کہ سورۂ توبہ میں آیا ہے آپ پر واضح کیا گیا کہ ان کا والد عدوِ الٰہی تھا اس لیے اس کے حق میں دعا نہیں کی جا سکتی تو حضرت ابراہیم نے اس سے تبرّی فرما دی۔ ان کی والدہ کے بارے میں کوئی تصریح نہیں آئی۔ ممکن ہے وہ آپ کی نبوت سے پہلے رحلت فرما گئی ہوں اس لیے مکلّف نہ ہوں۔ بہر حال ان کے ایمان لانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

انسان کو اپنے والدین کی مغفرت کے لیے دعا مانگتے رہنا چاہیئے لیکن اس صورت میں جب کہ والدین مسلمان ہوں۔ اگر خدانخواستہ والدین مسلمان نہ ہوں تو پھر ان کے لیے دعائے مغفرت نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس سے حضرت ابراہیم کو منع فرما دیا تھا۔

حضرت ابراہیم نے جمیع اہل ایمان کے لیے جو دعا مانگی ہے اس میں تمام اولین و آخرین سب شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل کرے جو روز محشر اس دعا کے مصداق ثابت ہوں گے۔

۵۰

رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ۝ (بنی اسرائیل، آیت: ۲۴)

"اے میرے پروردگار، میرے والدین پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔"

سورہ بنی اسرائیل میں آیت ۲۳ سے لے کر آیت ۳۷ تک اللہ تعالیٰ نے مومنین کو چودہ ہدایات دی ہیں۔ یہ چودہ ہدایات اسلامی دستور کی بنیادی دفعات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کو بنیاد بنا کر اسلامی دستور کی تدوین بڑی آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ ان ہدایات میں سے پہلی تو یہ ہے کہ "لَا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ" (سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہ کرو) اور آخری یہ ہے "لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا" (زمین پر اکڑ کر نہ چلو) ان دونوں کے درمیان بارہ ہدایات دیگر ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہدایت ۲ میں والدین کے حقوق کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں پہلے تو یہ سمجھایا گیا ہے کہ والدین اللہ اور اس کے رسول کے بعد سب سے زیادہ اطاعت اور خدمت کے مستحق ہیں۔ ان کی خدمت کے لیے بھرپور کوشش فریضہ ایمان ہے۔ ان کی نافرمانی کسی صورت بھی جائز نہیں الا یہ کہ وہ معصیت کا حکم دیں۔

جسمانی خدمت کے علاوہ والدین کا ایک بہت بڑا حق یہ بھی ہے کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کی جائے۔ انہوں نے جس محبت اور شوق سے بچپن میں اولاد کو پالا پوسا تھا اور اس کے آرام کے لیے اپنی راحت قربان کی تھی اس کا حق تو کسی صورت ادا نہیں ہو سکتا تاہم اس کی ادائیگی کی کوشش میں ان کی آخرت کے لیے توشہ دعاؤں کی صورت میں جمع کرتے رہنا نہایت اہم ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد دنیا سے اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے مگر تین چیزیں اس کے لیے

مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ (۱) علم نافع ۔ جس سے خلقِ خدا کو راہِ نجات دکھائی۔ (۲) صدقہ جاریہ ۔ (۳) اولادِ صالح جو اس کے حق میں دعائے مغفرت کرتی رہے ۔ پس ہر نیک بخت مومن کا کام ہے کہ اپنے مومن والدین کے لیے دعائے مغفرت اور طلب رحمت کرتا رہے ۔

(۵۱)

رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝ (بنی اسرائیل آیت: ۸۰)

" پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے ۔"

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی تھی۔ اس دعا کے نزول کا زمانہ ہجرت نبوی سے کچھ پہلے کا ہے ۔ دعا سے پہلے یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز پنجگانہ اہتمام و التزام کے ساتھ قائم کرو اور تہجد بھی پابندی سے پڑھا کرو۔ یہ تہجد حضور اکرم کے لیے واجب قرار دیا گیا اور اُمت کے لیے سنت ۔ تہجد کے اس حکم کے بعد یہ دعا کرنے کی تاکید فرمائی گئی۔ اس دعا میں دخول و خروج کے ساتھ صداقت کی قید لگائی گئی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو کوئی بھی کام کرتے وقت صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے ۔

دعا کے آخری حصے میں اقتدار کا مطالبہ کیا گیا ہے ۔ اس کے بارے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے رشحاتِ قلم پیشِ خدمت ہیں۔ آپ سورۂ بنی اسرائیل حاشیہ ۱۰۰ میں اس نکتے کی وضاحت یوں فرماتے ہیں۔

" یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں، فواحش و معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں ۔" یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے کی ہے ، اور اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کرتی ہے کہ " اِنَّ اللّٰہ

لَیَزَعُ بالسلطانِ مالا یزع بالقرآن "۔ یعنی " اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدِ باب کر دیتا ہے جن کا سدِ باب قرآن سے نہیں کرتا۔" اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دعا اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامتِ دین اور نفاذِ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو، رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے۔ اگر جہاد کے لیے تلوار کا طالب ہونا گناہ نہیں ہے تو اجرائے احکامِ شریعت کے لیے سیاسی اقتدار کا طالب ہونا آخر کیسے گناہ ہو جائے گا ؟"

یہ دعا ہر مہم شروع کرنے سے پہلے اور ہر کام کا آغاز کرتے ہوئے کر لینی چاہیے۔ جو شخص یا جماعت دینِ حق کے غلبہ کی خاطر میدانِ عمل میں سرگرم ہو اس کے لیے یہ دعا بہت بڑا ہتھیار ہے۔ ہر کام میں سچائی کی طلب اور اس کی بالاتری کی خواہش بندۂ مومن کا امتیازی وصف ہے اور اس کے عملی نفاذ کے لیے قوت اقتدار لازمی چیز ہے۔ پس مومن کا کام یہی ہے کہ وہ اپنی جدوجہد اسی مقصد کے لیے کرتا ہے کہ اسلامی نظام کا غلبہ اور باطل کا خاتمہ ہو سکے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر تدبرِ قرآن جلد سوم میں اس دعا کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ " دُعا میں ادخلنی مدخل صدقٍ کا اَخرِجنِی پر مقدم ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے داخلے کا انتظام تمہارے نکلنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اور "مِن لّدنکَ" کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ گویا ظاہری حالات کیسے ہی نامساعد و مخالف ہوں لیکن تمہارا رب اپنے پاس سے تمہارے لیے سارے انتظام فرمائے گا۔" یعنی ہجرت اور دخولِ مدینہ کی طرف اشارہ ہے۔" (صفحہ ۷۷۶)

۵۲

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝

(الکہف، آیت: ۱۰)

"اے ہمارے پروردگار، ہم کو اپنی رحمتِ خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے"

یہ دعا اصحابِ کہف نے مانگی تھی۔ اصحابِ کہف کا قصہ بہت مشہور ہے۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کا تذکرہ قریش مکہ کے سوالات کے جواب میں آیا ہے۔ قریش مکہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوال پوچھے تھے۔ (۱) اصحاب کہف کون تھے (۲) خضر کون تھا۔ (۳) ذوالقرنین کون تھا۔ سورہ کہف میں ان تینوں سوالوں کے جواب دیئے گئے ہیں اور اس کے ساتھ قریش مکہ کی اسلام دشمنی اور مسلمانوں کے صبر و استقامت کی مناسبت سے ہر قصہ کو نہایت مؤثر اور دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اصحاب کہف حضرت عیسٰی علیہ السلام کے پیرو تھے۔ رومی شہنشاہ دقیانوس جس نے ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک حکومت کی، حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروؤں کا سخت دشمن تھا۔ اس نے اپنے دور میں ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ پورے ملک میں جب اس نے عیسائیت (عیسائیت تو عرفِ عام کی وجہ سے لکھ دیا ہے ورنہ وہ اسلام ہی تھا) کا نام لینے والوں کا خاتمہ کر دیا تو چند نوجوان اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے شہر سے نکل کر پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے "اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝" یعنی "وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔"

ان نوجوانوں کو دین سے والہانہ محبت اور خدا سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ انہوں نے عزم کر لیا تھا کہ راہِ حق سے روگردانی نہیں کریں گے اور اس کو انہوں نے خوب نبھایا۔ وہ پہاڑ کی ایک غار میں جا چھپے اور وہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں سلایا تو ایسا کہ تین صدیاں آرام سے سوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کروٹیں بدلتا رہا، کبھی بائیں جانب، کبھی دائیں جانب۔ وہ اللہ کے ہو گئے تھے تو اللہ کی شفقت بھی تو ان کے لیے بے پایاں تھی۔

اصحاب کہف کی تعداد مختلف بتائی گئی ہے تاہم زیادہ معتبر قول یہ ہے کہ وہ سات تھے اور ان کے ساتھ آٹھواں ان کا کتا تھا۔ یہ کتا غار کے منہ پر پاؤں پھیلائے سوتا رہا اور تین صدیوں کے دوران جو بھی کبھی اس رستے سے گزرا اس پر خوف طاری ہو گیا اور کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ غار کے اندر جھانک کر دیکھے۔

ان نوجوانوں نے اپنے شہر سے نکلتے ہوئے سوچا تھا کہ ظالم بادشاہ نے تو اسلام کا نام لینے والوں کو ختم کر دینے کی قسم کھا رکھی ہے، اب ہمیں خدا کے بھروسے پر یہاں سے نکل چلنا چاہیئے اور اسلام کے بچاؤ کے لیے کسی غار میں پناہ لینی چاہیئے۔ جب وہ شہر سے نکلے جا رہے تھے تو اس وقت انہوں نے خدا سے یہ دعا مانگی تھی۔ "اے مولائے کریم ہمیں اپنی رحمت سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے۔" اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا سن لی، انہیں بڑی شفقت اور محبت سے غار میں سلائے رکھا۔ "نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ" یعنی "ہم انہیں دائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے۔"

تین صدیوں میں ملک میں بڑے انقلاب رونما ہو گئے۔ حکومت کی مشینری میں بہت بڑا تغیر آ گیا۔ دقیانوس جیسے اسلام دشمن کی جگہ تھیوڈوسیس ثانی برسر اقتدار تھا جس نے دینِ عیسوی قبول کر لیا تھا۔ اصحابِ کہف بیدار ہوئے تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے تھوڑی دیر پہلے سوئے تھے۔ انہیں بھوک لگ رہی تھی۔ اپنے ایک ساتھی کو بھیجا کہ چوری چھپے جائے اور خاموشی سے کھانا خرید کر لے آئے۔ تین صدیوں کا پرانا سکہ دیکھ کر دکاندار حیران رہ گئے۔ جلد ہی یہ معاملہ کھل گیا اور پتہ چلا کہ یہ تو وہی لوگ ہیں جو دین کی حفاظت کے لیے ہجرت کر گئے تھے۔ بادشاہ اپنے درباریوں کے ساتھ غار کے منہ پر پہنچا۔ اصحاب کہف تھوڑی سی دیر تک بیدار رہے، اہلِ ملک سے بات چیت بھی کی اور پھر ہمیشہ کے لیے سو گئے۔

یہ واقعہ افسس شہر میں پیش آیا۔ اس کے کھنڈرات ترکی کے شہر سمرنا سے ۲۰۔ ۲۵ میل دور پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں کے فرقہ صدوقیہ نے آخرت کا انکار کر دیا تھا اور یونانی فلسفے کے زور سے وہ اس کو ثابت کر دیتے تھے۔ اس واقعہ نے جس میں تین صدیوں تک سلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو بیدار کر دیا تھا، ان کے باطل نظریے

کی قلعی کھول دی اور ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ وہ طویل عرصے کے بعد دوبارہ زندگی دے سکتا ہے۔

یہ دعا جوان عالی ہمت جوانوں نے آج سے اٹھارہ صدیاں قبل مانگی تھی، آج بھی بالکل تر و تازہ ہے۔ آج بھی جب کبھی کوئی مشکل اہلِ حق کے راستہ میں آجائے اور وہ اصحابِ کہف جیسے جذبۂ صادق کے ساتھ یہ دعا حضورِ ربانی میں پیش کریں تو وہاں سے خود بخود معاملات کی درستی کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ اس دعا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ حق کو اپنے ایمان و ضمیر کی حفاظت کے لیے پہلے خود کمربستہ ہونا پڑتا ہے پھر اپنا معاملہ سپردِ خدا کر کے مطمئن ہو جانے کی منزل آتی ہے۔

کوئی بھی معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی (حق کے خلاف اور انصاف کے منافی نہ ہو) جب کسی انسان کے سامنے آجائے تو وہ اس معاملے کو ذہن میں یاد کر کے حضوریٔ قلب کے ساتھ یہ دعا مانگے۔ امید ہے انشاء اللہ دعا قبول ہو گی۔

۵۳

رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَائِي وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ مریم ۴-۶

"اے پروردگار، میری ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے کی وجہ سے بھڑک اٹھا ہے (بال سفید ہو گئے ہیں) اے پروردگار، میں کبھی تجھ سے دعا مانگ کر نامراد نہیں ہوا۔ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں کے بھٹک جانے کا خوف ہے، اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو مجھے اپنے فضل خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آلِ یعقوب کی میراث بھی پائے، اور اے پروردگار، اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا۔"

یہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا ہے۔ اس کا تذکرہ سورۂ آل عمران کی دعاؤں میں گزر چکا ہے۔ دعا کے وقت حضرت زکریا علیہ السلام بہت عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی اور ان کی بیوی بھی بانجھ تھی۔ انہیں اولاد کی خواہش اس لیے بھی پیدا ہوئی کہ کوئی ان کا وارث ہو اور یہ فطری خواہش تھی اور اس لیے بھی کہ کوئی میراثِ یعقوب کا حق ادا کرنے والا ان کے بعد بھی دنیا میں موجود رہے یہ ان کی اسلام سے والہانہ محبت کی علامت تھی۔ میراثِ یعقوب وہی دین تھا جس کو حضرت ابراہیم نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور جس کے بارے میں حضرت یعقوب نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔ "یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝" یعنی "اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایک طریقۂ زندگی منتخب کر لیا ہے پس تم اس حال میں دنیا سے اٹھنا کہ اللہ کے مطیع اور اسلام کے پابند کہلا سکو۔"

دعا کے وقت اگرچہ بظاہر حالات ایسے تھے کہ اولاد پیدا نہ ہو سکتی تھی مگر حضرت زکریا کے خدا پر بھروسے اور اعتماد کا یہ عالم تھا کہ وہ کہہ رہے تھے "میں تجھ سے دعا مانگ کر کبھی نامراد نہیں ہوا۔" حضرت زکریا کی یہ دعا قبول ہوئی اور انہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسا بیٹا عطا کیا گیا جس کو اللہ تعالیٰ نے تاجِ نبوت سے سرفراز فرمایا۔ یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں جن کے بارے میں اسی سورۂ مریم میں خدا نے کہا ہے کہ "ہم نے اسے بچپن میں ہی قوتِ فیصلہ بخش دی تھی اور اسے اپنی طرف سے نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی۔ وہ بڑا پرہیزگار اور اپنے والدین کا حق شناس تھا۔ وہ نہ جبّار تھا اور نہ نافرمان۔ سلام اس پر کہ جس روز وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے اور جس روز وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے۔"

اللہ تعالیٰ سے اولاد کی دعا کرتے وقت "اولادِ صالح" کی دعا کرنی چاہیے۔ اولادِ صالح دنیا میں بہت بڑی نعمت ہے اور آخرت میں باعثِ اجر و ثواب اور موجبِ بلندئ درجات۔

اولاد سے محروم لوگوں کو یہ دعا کرتے رہنا چاہیئے:۔

"رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا"

"وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا"

۵۷

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ لا وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۝ لا وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝ لا يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝ ص وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ لا هٰرُوْنَ اَخِي ۝ لا اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ لا وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝ لا كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ لا وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ ط اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝ (طٰہٰ، آیات: ۲۵ تا ۳۵)

"پروردگار، میرا سینہ کھول دے، اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے، اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں، اور میرے لیے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کر دے۔ ہارون جو میرا بھائی ہے اس کے ذریعے سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے، تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگراں رہا ہے۔"

یہ دعا سیدنا موسیٰ کلیم اللہ کی ہے۔ مدین سے اپنی اہلیہ کے ساتھ مصر کی جانب آ رہے تھے تو راستہ میں وادئ طویٰ میں پہنچے تو رات کے وقت سخت سردی اور بارش میں گھر گئے۔ ایک طرف روشنی نظر آئی، سمجھے کہ آگ ہے۔ آگ لینے کے لیے روشنی کی جانب گئے۔ بقعۂ نور میں سے آواز آئی "یٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ" (اے موسیٰ میں تیرا پروردگار ہوں۔ تو جوتے اتار دے۔) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس غریب الدیار مسافر کے ساتھ کلام فرمایا۔ اس کی تفصیلات قرآن مجید میں بہت جگہوں پر آئی ہیں۔ جب اللہ کی طرف سے فریضۂ رسالت آپ کے سپرد کیا گیا تو ایک مرتبہ آپ اس کے بوجھ کا احساس کر کے کانپ اٹھے۔ اللہ نے حکم دیا کہ "اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ...." (جا فرعون کے پاس جا کر ہمارا حکم سنا دے، بیشک اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے)

یہ فریضہ آپ کے ذمے لگایا گیا تو آپ نے بارگاہِ ربانی میں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی۔ اس دعا میں سب سے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ "میرا سینہ کھول دے"، یعنی حوصلے و عزم کی قوتِ وافر

عطا کر، صبر و استقامت کی دولت بخش، تحمل و بردباری کی توفیق دے اور فہم و فراست سے مالا مال کر۔ دوسرا مطالبہ آپ نے یہ کیا کہ " میرے کام کو آسان کر دے "۔ یعنی کام اگرچہ بڑا مشکل اور کٹھن ہے لیکن میں دل چھوڑ کر بیٹھے نہیں رہوں گا بلکہ تیرے بھروسے پر اس بارِ عظیم کو اٹھاؤں گا۔ آگے تیرا کام ہے کہ میری ان مشکلات کو آسان اور سہل بنا دے۔ تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ " میری زبان کی عقدہ کشائی کر دے " یعنی میں نے ایک طویل عرصہ دشتِ مدین میں بکریاں چرائی ہیں، میرا کوئی تقریری تجربہ نہیں ہے، تو اپنی رحمت سے مجھے جوہرِ خطابت سے حصۂ وافر عطا کر کیونکہ یہ فریضۂ تبلیغ اسلام اس کا تقاضا کرتا ہے اور اس کے بغیر سامعین بات کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی زبان میں لکنت تھی مگر یہ اسرائیلی روایات کے رطب و یابس کی خوشہ چینی ہے۔ فی الحقیقت اللہ کا کوئی نبی کسی قسم کے جسمانی و اخلاقی عیب کے ساتھ مبعوث نہیں ہوا۔ جملہ انبیائے کرام تمام عیوب و نقائص سے پاک رکھے گئے۔ تاہم تقریر کا فن آغاز میں نہیں تھا۔ بعد میں پریکٹس سے اس میں ایسی جلا پیدا ہوئی کہ آپ نہایت قادرالکلام خطیب بن گئے۔ بہرحال حضرت ہارون آپ سے زیادہ تقریری صلاحیت رکھتے تھے جیسا کہ آپ نے خود خدا سے کہا تھا " وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا "۔ آپ نے چوتھا مطالبہ یہ کیا کہ آپ کے بھائی حضرت ہارون کو آپ کا وزیر بنایا جائے اور کارِ نبوت میں شریک کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر ذکر آیا ہے کہ حضرت ہارون کو موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے بعد معاون بنایا گیا۔

دعا کے آخر میں حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ کے سامنے وضاحت کرتے ہیں کہ ان کی اس دعا سے مقصود کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ " اگر یہ دعا قبول ہو گئی تو پھر ہم دونوں بھائی اس قابل ہو سکیں گے کہ فرعون کی حکومت اور اس کے دربار میں ڈنکے کی چوٹ خالقِ لاشریک کی پاکی بیان کریں، ہر قسم کی تعزیروں کے باوجود مالکِ حقیقی کے نام کا چرچا دور و نزدیک ہر جگہ عام کر دیں اور دار و رسن سے بے نیاز ہو کر ربِّ ذوالجلال کا کلمہ سربلند کر دیں۔

اس دعا میں آیت ۲۵ تا آیت ۲۸ جنرل مطالبات ہیں۔ اس کے بعد مخصوص مطالبے پیش کیے گئے ہیں۔ دعا کا پہلا حصہ ہر مومن کے لیے عام ہے، وہ اس سے استفادہ

کرسکتا ہے۔ دوسرا حصہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے مخصوص تھا۔ اسلام کی خاطر کام کرنے والے مقررین واعظین اور مبلغین کو تقریر سے پہلے یہ دعا کرنی چاہیے۔ تجربہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تقریر میں اثر پیدا کرتا ہے۔ اور سننے والوں کو سمجھانے میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

(۵۵)

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ، آیت: ۱۱۴)

"اے پروردگار، مجھے مزید علم عطا کر"

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی ہے۔ دعا کے الفاظ سے پہلے پہلے آیت قرآنیہ کے الفاظ ہیں "لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ" (قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔)

نزول قرآن کے آغاز میں حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام وحی سنتے ہی اسے یاد کرنے کی کوشش میں لگ جاتے تھے تاکہ اس عظیم ترین پیغام میں سے کوئی چیز بھول نہ جائے۔ آپ فرشتے سے کلام سنتے بھی جاتے اور دہراتے بھی جاتے، اس سے بسا اوقات اخذ وحی میں پوری طرح توجہ مترکز نہ رہتی بلکہ بٹ جاتی۔ اس صورت حال پر آنحضور علیہ الصلوٰۃ کو تین مقامات پر تنبیہہ کی گئی ہے۔ ایک تو سورۂ طٰہٰ کا یہی مقام ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ دوسرا مقام سورۂ الاعلیٰ پارہ عم میں ہے جہاں فرمایا گیا ہے "سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰٓی" (ہم عنقریب آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔) تیسرا مقام سورۂ قیامہ پارہ ۲۹ میں ہے جہاں ارشاد ہوا۔ "لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ، اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ، فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ، ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ" (قرآن مجید کو یاد کرنے کی کوشش میں بار بار اور جلدی سے زبان کو حرکت نہ دو، اسے یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمے ہے، لہٰذا جب ہم اسے سنا رہے ہوں تو غور سے سنو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارا ہی ذمہ ہے۔)

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو یہ بات بتائی کہ وہ علم کی دولت میں اضافے کی دعا مانگتے

رہا کریں۔ علمِ صحیح ایک ایسی نعمت ہے جس کا بدل کوئی نہیں۔ علمِ صحیح سے مراد وہ علم ہے جو انسان کو کائنات اور اس کے مقصدِ تخلیق، خالق اور اس کی پسند و ناپسند اور خود انسان اور اس کی راہ و منزل کی حقیقت سے روشناس کرا دے۔ اس علم کی طلب ہر وقت کرتے رہنا چاہیئے۔ یہی علمِ نافع ہے جو عمل کی ترغیب دیتا ہے اور جو علم عمل کی ترغیب نہ دے وہ غیر نافع ہے اور اس سے حدیث میں خدا کی پناہ مانگی گئی ہے۔ علم کی طلب میں کوشش و جدوجہد بھی کرنی چاہیئے اور ساتھ ہی خدا سے یہ دعا بھی کرتے رہنا چاہیئے۔ خشیئتِ الٰہی کا حق ادا کرنا علم کے بغیر ممکن نہیں۔ "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔" (سورۂ فاطر، آیت: ۲۸)

(۵۶)

(رَبِّ) اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝

(الانبیاء، آیت: ۸۳)

"(اے میرے پروردگار!) مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"

یہ مختصر دعا اللہ کے نبی حضرت ایوبؑ علیہ السلام کی ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آپ حضرت اسحاق کے بیٹے اور حضرت یعقوب کے بھائی عیسو کی اولاد میں سے تھے۔ یہ خیال وھب بن مُنَبِّہ کا ہے جو یہودیت ترک کر کے داخلِ اسلام ہوئے تھے اور جماعتِ صحابہ میں شامل ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا خیال ہے کہ وہ نبی اسرائیل میں سے تھے (تفہیم القرآن جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۶) اس کے لیے مولانا نے مندرجہ ذیل دو مقاماتِ قرآنی سے استدلال کیا ہے۔

(۱) سورۂ نساء آیت ۱۶۳ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ "ہم نے آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف اسی طرح وحی کی ہے جس طرح نوحؑ، ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، عیسٰیؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی بھیجی گئی اور ہم نے داؤدؑ کو زبور دی اور موسٰیؑ سے کلام فرمایا ......" یہ سلسلۂ انبیاء یعقوب علیہ السلام کے بعد ان کی ولا

کے افراد پر ہی مشتمل ہے، اس لیے مولانا کا خیال ہے کہ ایوب بھی بنی اسرائیل میں سے تھے۔

(۲) سورۂ انعام آیت ۸۴۔ اس مقام پر حضرت ابراہیم کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ :۔ "ہم نے اسے اسحٰق اور یعقوب بخشے۔۔۔۔۔۔ کُلًّا ھَدَیْنَا وَنُوحًا ھَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّیَّتِہٖ دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ وَاَیُّوْبَ۔۔۔۔۔۔" یہاں بھی جس انداز اور سیاق میں حضرت ایوب کا ذکر آیا ہے اس کے پیشِ نظر مولانا کا خیال ہے کہ حضرت ایوب بنی اسرائیل میں سے تھے۔

میرے نزدیک ذُرِّیَّتِہٖ میں ہ کی ضمیر کا مرجع ابراہیم اور نوح دونوں ہو سکتے ہیں۔ اگر حضرت نوح کی اولاد سے حضرت ایوب کو مانا جائے تو لازمی نہیں کہ وہ ابراہیمی النسل بھی ہوں اور اگر انہیں حضرت ابراہیم کی نسل سے (مرجع ہ کو ابراہیم سے متعلق تسلیم کر کے) مانا جائے تو بھی واضح نہیں کہ وہ حضرت ابراہیم کی کس شاخ سے تھے۔ ممکن ہے وہ اسرائیلی ہوں، ممکن ہے عیسو کی اولاد سے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے کسی اور فرزند کی نسل سے ہوں۔ ایک قول حضرت ایوب کے بارے میں یہ بھی ہے کہ وہ عرب تھے۔ اس کا مطلب ہے آپ حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے لیکن یہ بات زیادہ قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ حضرت ابراہیم کی شاخ بنو اسماعیل میں صرف دو ہی انبیاء آئے ہیں ایک حضرت اسماعیل اور دوسرے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بحث تھی اصل بات یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے اور ان کی یہ دعا نہایت اہم دعاؤں میں سے ہے۔ حضرت ایوب کے پورے جسم میں پھوڑے نکل آئے تھے۔ آپ کے سر سے لیکر پاؤں تک کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو ناسور نہ بن چکی ہو۔ اس دردناک بیماری کے باوجود بھی حضرت ایوب نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہ دنیا جب تک قائم ہے اور سورج کے طلوع و غروب کا عمل جاری ہے صبرِ ایوب ایک ناقابلِ فراموش حقیقت کی حیثیت سے زندہ رہیگا! اور جب روزِ جزا اللہ کے ہاں معاملات پیش ہوں گے تو باری تعالیٰ اپنے اس صابر و شاکر پیغمبر پر فخر کریں گے۔

آپ کی یہ مختصر دعا نہایت جامع ہے۔ مرشد مودودی لکھتے ہیں :۔

"اس طرزِ دعا میں کچھ ایسی شان نظر آتی ہے جیسے کوئی انتہائی صابر و قانع

اور شریف و خود دار آدمی پے در پے فاقوں سے بے تاب اور کسی نہایت کریم النفس ہستی کے سامنے بس اتنا کہہ کر رہ جائے کہ "میں بھوکا ہوں اور آپ فیاض ہیں" آگے کچھ اس کی زبان سے نہ نکل سکے۔"

(تفہیم القرآن جلد سوم، سورہ الانبیاء، حاشیہ ۷۷)

بیماریاں پیدا کرنے والے نے ان کی دوائیں بھی پیدا کی ہیں۔ ہر بیماری کے لیے کوئی نہ کوئی دوا ضرور ہے مگر موت کا علاج کوئی نہیں ہے۔ بیماریاں جہاں دواؤں سے دُور کی جا سکتی ہیں وہاں دعائیں بھی ان کے سدِ باب کا ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مادی علاج اور دوائیں کسی بیماری کے مقابلے سے عاجز آجاتے ہیں اور معالج مایوس ہو کر مریض کو لاعلاج قرار دے دیتے ہیں تو پھر روحانی دوا یعنی دعائیں انسان کا سہارا بنتی ہیں۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ کئی مرتبہ ایسے مایوس مریض سخت اضطراب اور پریشانی کے عالم میں خدا کے سامنے گڑگڑاتے ہیں اور وہ ان کی دعا سن کر داد رسی کرتا ہے۔ سورہ النمل آیت ۶۲ میں اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے:۔

" اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ " (کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اُسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے۔)

حضرت ایوب علیہ السلام کی مذکورہ بالا دعا ہر بیماری اور مصیبت کے موقع پر مومن کے لیے بڑا سہارا بن سکتی ہے۔

۵۷

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ج ۱۷

(الانبیاء، آیت: ۸۸)

" (اے پروردگار) تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا۔"

یہ دعا حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں مانگی تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام

بنی اسرائیل میں سے تھے۔ آپ کا زمانہ ۸۶۰ء سے ۷۸۴ء قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے آپ عراق میں اسیریا والوں کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس علاقے کا مرکز نینوی تھا۔ اس کے کھنڈرات دریائے دجلہ کے کنارے موصل شہر کے بالمقابل پائے جاتے ہیں (ماخوذ از تفہیم القرآن جلد دوم سورۂ یونس حاشیہ ۹۸)

حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں کیسے پہنچ گئے۔ سورۂ یونس، سورہ الانبیاء اور سورۂ الصّٰفّٰت میں اس کا تذکرہ آیا ہے۔ سب مقامات کو ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے جب اسلام پیش کیا تو انہوں نے انکار کر دیا، آپ کوشش کرتے رہے مگر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آپ نے غصّے میں آکر قوم کو کہہ دیا کہ تین دنوں کے بعد تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ پھر آپ اللہ کے حکم کے بغیر رات کے وقت وہاں سے نکل گئے ادھر قوم تیسرے دن عذاب کے آثار دیکھتے ہی تائب ہو گئی، اپنے پیغمبر کی تلاش شروع کر دی اور جب وہ نہ ملے تو اپنے اہل و عیال اور مال مویشی لے کر صحرا میں نکل آئی۔ اللہ تعالیٰ نے عذاب ٹال دیا اور یہ استثنائی صورت صرف حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے ساتھ پیش آئی۔ اس کے علاوہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں گزری۔ "فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَآ إِيْمَانُهَآ إِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ط"

قوم کے ساتھ تو یہ معاملہ درپیش آیا اور حضرت یونس علیہ السلام ایک ابتلا میں گرفتار ہو گئے۔ آپ ایک کشتی میں بیٹھ گئے۔ کشتی جب ساحل سے دور چلی گئی تو زیادہ بوجھ کی وجہ سے ڈوبنے لگی۔ کشتی والوں نے اس صورتِ حال میں فوراً فیصلہ کر لیا کہ ایک آدمی کی قربانی دی جائے، اسے سمندر میں پھینک دیا جائے اور باقی لوگوں کی جان بچالی جائے۔ اب سمندر میں کسے پھینکیں۔ قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا طے پایا۔ قرعہ حضرت یونس کے نام نکلا۔ آپ کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔ چونکہ آپ اللہ کے حکم کے بغیر قوم کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ کو یہ سفر پسند نہ تھا۔ سمندر میں پھینکے گئے تو ایک مچھلی کو حکم دیا۔ اس نے آپ کو نگل لیا۔ مچھلی کے پیٹ میں جہاں اندھیروں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا، حضرت یونس علیہ السلام کو اپنی غلطی کا فوراً احساس ہوا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ "لَا مَلْجَأَ إِلَّا إِلَيْهِ" (اب اس ہستی

کے سوا کوئی سہارے کی جگہ نہیں ہے) پس آپ نے اپنے پروردگار کو مدد کے لیے پکارا "اے مولا تیرے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک میں نے تیرے حکم کے بغیر سفر اختیار کر کے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا سن لی اور انہیں غم سے نجات دے دی۔ مچھلی کو حکم ہوا انہیں سمندر کے باہر میدان میں پھینک دے۔ مچھلی نے آپ کو ایک چٹیل میدان میں پھینک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے کدو کی بیل ان کے اوپر اگا کر ڈال دی۔ اس کے پتوں کا سایہ اور وہی بستر، اسی سے غذا اور پانی۔

اس دعا کو آیت کریمہ بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے عوام میں یہ عقیدہ عام پایا جاتا ہے کہ آیت کریمہ کا ورد ایک لاکھ مرتبہ کیا جائے تو ہر حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ دُعا اللہ کے ایک پیغمبر نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے حضوریٔ قلب اور خلوص نیت کے ساتھ مانگی تھی۔ ندامت کے آنسو اور دل کی پشیمانی اس کے ساتھ شامل تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے دعا کو قبول فرمالیا۔ یہ تو گناہ سے معافی کا نسخہ ہے حاجات کے حصول کا گر نہیں۔ حاجات بھی اگرچہ اسی در سے پوری ہوتی ہیں مگر پہلے حاجات کی کیفیت بھی تو دیکھی جائے۔ حاجات اگر درست اور جائز ہوں اور کسی پر ظلم و عدوان اور حق تلفی و قطع رحمی سے پاک تو ان کے پورا ہونے کی بھی دعائیں ہیں۔

اس دعا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے جب کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو اس کی تاویلات و توجیہات کے دھندے میں نہ پڑے بلکہ سیدھے طریقے سے اس کا اعتراف کرے۔ بندوں کو تو عذر ہائے لنگ سے "اندھا" بنایا جا سکتا ہے مگر اس ہستی سے تو کوئی چیز چھپائی نہیں جا سکتی جس کی شان یہ ہے۔ "یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ" (وہ آنکھ کی خیانت سے بھی باخبر ہے اور سینوں میں چھپے ہوئے راز بھی اس سے پوشیدہ نہیں) اعتراف کرنے کے ساتھ ہی سچے دل سے اس غلطی سے تائب ہوا اور گڑ گڑا کر اپنے مولیٰ سے معافی مانگے۔ دوسرے یہ کہ انسان پر جب بھی کبھی کوئی مصیبت نازل ہو جائے، خواہ وہ کتنی بڑی ہی کیوں نہ ہو، اسے حوصلہ ہار کر مایوس ہو کر نہیں بیٹھ رہنا چاہیئے۔ مصائب سے نجات دینے والا اور مسبب الاسباب

جب موجود ہے تو غم کا ہے کا۔ اس کے در سے جو کچھ مانگو ملے گا، وہ مصائب کو دور کرکے آرام و راحت کی دولت سے مالا مال کر دے گا۔[1]

(۵۸)

رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝

(الانبیاء، آیت: ۸۹)

"اے پروردگار، مجھے تنہا نہ چھوڑ، اور بہترین وارث تو تو ہی ہے۔"

یہ دعا حضرت زکریا علیہ السلام کی ہے۔ آپ کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ عمر رسیدہ بھی تھے اور بیوی بھی بانجھ تھی۔ آپ نے یہ دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام ان کے ہاں پیدا کیے۔ سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم کی دعاؤں میں تفصیل آ چکی ہے۔

بے اولاد لوگوں کے لیے یہ دعا نہایت مفید ہے۔

---

[1] محمد الغزالی نے اپنی کتاب فقہ السیرۃ کے صفحہ ۱۳۱۔ ۱۳۲ پر حضور کے سفر طائف کا تذکرہ بیان کرتے لکھا ہے، کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سخت زخمی حالت میں طائف سے باہر نکلے اور اپنے جاں نثار صحابی زید بن حارثہ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے تو قریب کے باغ سے جو ربیعہ کے دو بیٹوں کی ملکیت تھا ایک غلام نے اپنے مالکوں کے حکم سے انگوروں کے گچھے پلیٹ میں رکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ نے بسم اللہ کہہ کر انگور کھانے شروع کر دیئے۔ غلام نے تعجب سے کہا۔ "اس شہر کے لوگ تو یہ الفاظ نہیں کہتے۔" آپ نے پوچھا۔ "تم کس شہر سے ہو؟" غلام نے جواب دیا "میں نصرانی ہوں اور شہر میرا نینویٰ ہے۔" آپ نے فرمایا: "اچھا تو تم مرد صالح یونس بن متی کے ہم وطن ہو۔" غلام نے حیرت سے پوچھا "آپ یونس بن متی سے کیسے واقف ہیں؟" آپ نے فرمایا "وہ میرا بھائی تھا۔ وہ بھی اللہ کا پیغمبر تھا اور میں بھی اللہ کا پیغمبر ہوں۔" یہ سن کر غلام عداس نے آپ کے ہاتھ چوم لیے۔

یہ واقعہ سیرت کی تمام کتب میں مذکور ہے۔

رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا کَذَّبُوْنِ ○ (المومنون، آیت: ۲۶)

"پروردگار، ان لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے اس پر اب تو ہی میری نصرت فرما۔"

یہ دعا حضرت نوح علیہ السلام نے مانگی تھی۔ انہوں نے جب قوم کے سامنے پیغامِ حق پیش کیا تو سردارانِ قوم نے ان کے خلاف جھوٹے الزامات اور زہریلے پروپیگنڈے کی ایک زبردست مہم چلا دی۔ انہیں پاگل (نعوذ باللہ) کہا گیا اور انہیں اور ان کے صحابہ کرام کو جسمانی اذیتیں دی گئیں۔ مخالفانہ پروپیگنڈے میں ایک بات یہ کہی جاتی تھی کہ معاشرے کے رذیل (نعوذ باللہ) لوگ نوح کے ساتھ ہیں (وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُوْنَ)۔ دوسرا پروپیگنڈہ یہ تھا کہ ہماری طرح ہی بشر ہے، کھاتا پیتا ہے، اس کی پیروی کی کوئی معقول وجہ اور سند نہیں ہے، اس لیے اس کی پیروی کرنا پرلے درجے کی حماقت اور جہالت ہے۔ تیسرا الزام یہ تھا کہ دراصل یہ اللہ کا نام تو ویسے ہی لیتا ہے، اصل میں مقصدِ وحید یہ ہے کہ اس ذریعے سے کرسی پر قبضہ کر لے۔ یہ اقتدار کا بھوکا ہے (يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ)

اس ہٹ دھرم قوم نے بہت ڈھٹائی کے ساتھ انکارِ حق کیا اور اللہ کے پیغمبر کے درپے آزار رہی۔ آخر طویل عرصہ کے بعد آنجناب نے بارگاہِ خداوندی میں دعا فرمائی کہ وہ اپنے پیغمبر اور اس کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ کر دے۔ یہ گویا اس قوم کے لیے بددعا تھی۔ حضرت نوح کی اس بددعا کا ذکر سورۂ القمر اور سورۂ نوح میں بھی آیا ہے۔ (جو آگے آئے گا۔)

یہ نہایت مختصر دعا ہے۔ اس میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا کیس پیش کر دیا ہے۔ آپ نے قوم کی خیرخواہی اور اسے آگ سے بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور جواب میں قوم نے آپ کو دکھ اور اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کے جواب میں اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ حضرت نوح کو بتا دیا کہ قوم طوفان کے عذاب میں گرفتار ہو گی۔ اہلِ ایمان بچا لیے جائیں گے، ان کے لیے ایک کشتی تیار کر لو۔ پس کچھ عرصہ کے بعد اس قوم پر ایسا طوفان آیا کہ آج تک "طوفانِ نوح" ضرب المثل ہے۔ پیغمبر اور اس کے ساتھی محفوظ رہے۔

۶۰

رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَکًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ○ (المومنون، آیت ۲۹)

"پروردگار مجھ کو برکت والی جگہ اتار، اور تو بہترین میزبان ہے۔"

کشتی میں سوار ہونے کے بعد حضرت نوح اور آپ کے ساتھیوں نے دیکھا کہ وہ بڑے بڑے جبارین جو زمین الٰہی پر اکڑتے پھرتے تھے اور اللہ کے بندوں کے مقابلے پر رعونت و تکبر کا رویہ اختیار کیے ہوئے تھے، بدترین عذاب میں گرفتار تھے اور یہ کمزور و ناتواں بندے، خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے اس کے دین کا علم اٹھانے والے مجاہد اپنی کشتی میں محفوظ و مامون طوفان کی بلاخیز موجوں کو چیرتے چلے جا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ جس کے دین کی خاطر ان لوگوں نے قربانیاں دی تھیں، آج ان کی مدد و نصرت کے لیے ان کے سر پر اپنا سایۂ شفقت ڈالے ان کی حفاظت کر رہا تھا۔ یہ موقع دیکھ کر حضرت نوح اور آپ کے ساتھیوں کے دل میں خدا کے لیے جذبۂ تشکر ابھر آیا اور خدا نے خود انہیں سکھایا کہ وہ کس طرح شکر ادا کریں۔ حکم ہوا "قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○" (کہو شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی)۔

اللہ کا شکر ادا کرنے کے بعد ہدایتِ ربّانی کے مطابق حضرت نوح آئندہ اپنی آسائش و راحت کے لیے خدا تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں کہ "اے اللہ مجھ کو برکت والی جگہ اتار اور تو بہترین میزبان ہے"۔ مُنْزَلًا کا لفظی معنی جائے نزول (اترنے کی جگہ) ہے اور مُنْزِلِیْنَ کا معنی اتارنے والے ہے مگر عرفِ عام میں یہ الفاظ "میزبان کا گھر یا مہمان خانہ" اور "میزبان" کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں ـــــ قرآن مجید میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں مثلاً حضرت یوسف کے بھائی جب ان کے پاس غلہ لینے جاتے ہیں تو آپ انہیں کہتے ہیں کہ وہ اپنے گیارہویں بھائی کو بھی آئندہ ساتھ لے کر آئیں کیونکہ وہ (حضرتِ یوسف) پورا غلہ تول کر دیتے ہیں اور بہترین میزبان بھی ہیں۔ "اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْکَیْلَ وَاَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ" اسی طرح سورہ حٰمٓ السجدہ میں مومنوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے قیامت کے دن مہمان نوازی کا خوب اہتمام کیا جائے گا اور خدا تعالیٰ خود ان کا میزبان ہوگا۔ "نُزُلًا"

مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ ۔"

حضرت نوح علیہ السلام نے اس دعا میں خدا کے سامنے یہ عرضداشت پیش کی ہے کہ چونکہ وہ اور ان کے ساتھی اپنا سب کچھ چھوڑ کر جان و ایمان لے کر کشتی میں سوار ہوئے تھے، اور ان کا سامان زیست سارے کا سارا غرق طوفان ہو گیا تھا اس لیے اب یہ مسافر خدا ہی کے مہمان بنیں گے ۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ " یا اللہ تو بہترین میزبان ہے، ہمیں اچھی اور برکت والی جگہ اتارنا ۔" اللہ کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا جو سورۂ ہود میں مذکور ہے اللہ تعالےٰ نے فرمایا ۔ " یٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ " (اے نوح ہماری طرف سے تجھ پر سلام ہو ۔ تو سلامتی کے ساتھ اور برکت کے ساتھ اپنے صحابہ کے ہمراہ اس کشتی سے اتر (اور تم لوگ آرام سے زندگی گزارو))

۶۱

رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّىۡ مَا يُوۡعَدُوۡنَ ۞ رَبِّ فَلَا تَجۡعَلۡنِىۡ فِى الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ۞ (المومنون، آیت: ۹۳-۹۴)

" پروردگار، جس عذاب کی دھمکی (ان ظالموں کو) دی جا رہی ہے، وہ اگر میری موجودگی میں تو لائے، تو اے میرے رب مجھے ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو ۔"

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خود سکھائی ۔ اس دعا میں عذاب کی جس دھمکی کا ذکر ہے وہ یہاں سیاق و سباق میں نظر نہیں آتی ۔ ویسے قریش مکہ کی اسلام دشمنی اور ہٹ دھرمی کا ذکر کر کے کئی مقامات پر انہیں عذاب کی وعید سنائی گئی ہے ۔ مثلاً سورہ قصص آیت: ۵۹ میں فرمایا ۔ " وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهۡلِكَ الۡقُرٰى حَتّٰى يَبۡعَثَ فِىۡۤ اُمِّهَا رَسُوۡلًا يَّتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا‌ ۚ وَمَا كُنَّا مُهۡلِكِى الۡقُرٰٓى اِلَّا وَاَهۡلُهَا ظٰلِمُوۡنَ ۞ " (اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا ۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے)

اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا:- "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُولًا ۝"
(اور ہم اسوقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم اس میں اپنا رسول نہ بھیج دیں)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی قوم کو بغیر نوٹس دیئے اور بغیر اتمامِ حجت کیے عذاب میں گرفتار نہیں کرتا۔ یہاں قریشِ مکہ سے خطاب کرتے ہوئے وضاحت فرما دی کہ اب ہمارا پیغمبر تم تک ہمارا پیغام پہنچا چکا ہے۔ اور تم نے انکارِ حق کر کے ظلم کیا ہے۔ پس جان لو کہ ظالم گرفتارِ عذاب کیئے جاتے ہیں۔ سورہ سجدہ میں قریشِ مکہ کو واضح دھمکی دی گئی کہ ہم تمہیں بڑے عذاب کا مزا چکھانے سے پہلے چھوٹی چھوٹی سزائیں دیں گے۔ "وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنٰى دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ"

یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم عذاب سے بچنے کی جو دُعا مانگ رہے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدانخواستہ حضورؐ کو مبتلائے عذاب ہوجانے کا کوئی خطرہ تھا بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ عذابِ الٰہی سے ہمیشہ خدا کی پناہ مانگنا شیوۂ اہلِ حق ہے۔ نیز یہ بھی قانونِ قدرت ہے کہ اجتماعی گناہوں کی پاداش میں جب عذاب کا کوڑا برستا ہے تو صرف بڑے لوگ ہی نہیں پٹتے بلکہ بعض اوقات ان کے ساتھ نیک لوگ بھی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ گمراہ اور بدکار معاشرے میں رہتے ہوئے ہر بھلے اور نیک آدمی کو خدا کی پناہ مانگتے رہنا چاہیئے۔ کیا خبر کہ اللہ کی طرف سے کس وقت اور کس صورت میں ظالموں کے حق میں عذاب کا فیصلہ کر دیا جائے، اور گندم کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر فرمایا گیا ہے "وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ج" (الانفال، آیت: ۲۵) اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔

(۶۲)

رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ۝ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ

اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝ (المومنون، آیت: ۹۷-۹۸)

"پروردگار، میں شیطان کے بہکاوے سے تیری پناہ مانگتا ہوں، بلکہ اے میرے رب میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔"

یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی تھی۔ اس دعا میں شیطان کے ہتھکنڈوں سے خدا کی پناہ مانگی گئی ہے۔ دعا سے پہلے کی آیت میں تلقین کی گئی ہے کہ "برائی کو اچھے طریقے سے دفع کرو۔" یعنی موعظہ حسنہ اور حکمت تامہ سے کام لے کر مخالفین کی مخالفتوں کا توڑ کرنا چاہیئے۔ شیطان ہر وقت انسان کی گھات میں لگا رہتا ہے۔ اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے انسان کو گمراہ کرے۔ تبلیغ کے موقع پر جب مخالفین حق کٹ حجتیاں اور بحث وجدل بلکہ گالی گلوچ تک پہنچ جاتے ہیں تو اہل حق کو موقع کی مناسبت سے موعظہ حسنہ یا اعراض سے کام لینا چاہیے لیکن شیطان اس موقع پر بندۂ مومن کی انا اور خودی کو اپیل کرتا ہے تاکہ اسے اشتعال دلائے اور قبولِ حق کے لیے مخالفین کے لیے ہر ممکن راستے کو بند کر دے۔ ایسے موقع پر انسان کو شیطان کے حملوں سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے۔ اس نے روزِ اوّل سے ہی خدا کے دربار میں علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ "میں آدم اور اس کی اولاد کو گمراہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گا۔" اس کے طریقہ ہائے واردات بڑے خطرناک ہیں۔ وہ کبھی انسان کا ہمدرد و غمگسار بن کر اس کے دل و دماغ پر چھاپہ مارتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ کیوں انسان دنیا کی عیش و عشرت چھوڑ کر ایک نادیدہ دنیا کی خاطر مصائب جھیلے۔ کبھی وہ انسان کو اس کے علم کے غرور میں مبتلا کر کے گمراہ کرتا ہے اور کبھی انسان کو اس کے عمل و کردار کی بلندی دکھا کر شبخون مارتا ہے۔ کبھی وہ مختلف قسم کے وسواس اور شکوک و شبہات دل میں پیدا کر کے ایقان و یکسوئی کی دولت چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے حیلے لاتعداد ہیں اور ان سے بچنے کی تدبیر یہی ہے کہ اپنے آپ کو خدا کی پناہ کے مضبوط قلعے میں محفوظ کر لیا جائے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی ہے۔ سورۃ النحل میں فرمایا "فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝" (جب آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کیا کریں تو شیطان

ملعون سے خدا کی پناہ مانگ لیا کریں) اس کے بعد فرمایا کہ اس کا کوئی داؤ اور حملہ اہل ایمان کے مقابلے پر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ تو انہی لوگوں کو گمراہ کر سکتا ہے جو اس کے دوست بنتے ہیں اور خدا سے شرک کرتے ہیں۔" اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝ۧ

اسی طرح معوذتین میں بھی شیطان اور اس کے حواریوں کے حملوں سے بچنے کے لیے دعا سکھائی گئی ہے۔

یہاں اس دعا میں "ہمزات الشیاطین" کے الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیطان ایک نہیں بلکہ بے شمار ہیں۔ قرآن مجید میں "شیاطین الجن والانس" کا لفظ کئی اور مقامات پر بھی آیا ہے۔ ذریتِ شیطان کی ترکیب (شیطان کے پیروکار) بھی قرآن میں مذکور ہے۔ گویا اصل بنیاد تو ایک ہی شیطان "ابلیس" ہے لیکن اس کے چیلے چانٹے جنوں اور انسانوں کی نسل میں بہت زیادہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سب سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ بعض اوقات انسان کے اپنے اندر ایک شیطان بیٹھا ہوتا ہے جو اسے بے راہ روی کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی نفسِ امارہ ہوتا ہے۔ ہمیں اس سے بھی خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ اے اللہ ہمیں ہر قسم کے شیاطین اور ان کے جملہ حملوں سے محفوظ رکھ۔

(۶۳)

رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ؕ (المومنون، آیت ۱۰۹)

"ہمارے پروردگار، ہم ایمان لائے، ہمیں معاف کر دے، ہم پر رحم کر، تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے۔"

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندگانِ خاص کی صفت بیان کرتے ہوئے ان کی زبانی نقل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کا نقشہ کھینچ کر بتایا ہے کہ منکرینِ حق دوزخ میں مبتلائے

عذاب ہوں گے اور پکار کر کہیں گے کہ " باری تعالیٰ دنیا میں ہمیں بدبختی نے گھیر لیا۔ ہم گمراہ ہو گئے۔ اب ہمیں اس دوزخ سے نجات دے اور اگر ہم نے پھر پہلی روش اختیار کی تو بلاشبہ ہم ظالم ہوں گے۔" اللہ تعالیٰ جواب میں فرمائے گا " دور ہو جاؤ میرے سامنے سے، پڑے رہو اسی میں اور مجھ سے بات نہ کرو" پھر اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کا ذکر کرے گا جو دنیا میں مندرجہ بالا دعا مانگا کرتے تھے۔" اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ ـــــ سے يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ .... فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا .... اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○" (اور یاد کرو اس کافرو وہ وقت جبکہ) میرے کچھ بندے مجھ سے کہتے تھے کہ " اے ہمارے پروردگار، ہم ایمان لائے، ہمیں معاف کر دے، ہم پر رحم فرما، تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے۔" تو تم ان کا مذاق اڑاتے تھے.. ..... آج ان کو میں نے ان کے صبر کا بدلہ دے دیا ہے۔ وہ کامیاب و کامران ہیں)۔

یہ دعا کرنے والے جب کہتے ہیں " آمَنَّا " اور اس پر عمل پیرا ہو کر دکھاتے ہیں تو واقعتہً اہلِ باطل ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ " بیوقوف " لوگ خواہ مخواہ اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے اور اپنا مستقبل تباہ کرتے ہیں۔ یہ ان کے نزدیک اسی قابل ہیں کہ ان کا تمسخر اڑایا جائے۔ لیکن خوش قسمت ہیں یہ لوگ کہ جن کی اس دعا اور کردار کا حوالہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ دے گا۔ ان کا ذکر کیا جائے گا تو " عِبَادِيْ ۔ میرے بندے " کے الفاظ میں کیا جائے گا۔

اہلِ حق کا استہزا دنیا کے " فرزانوں " کا شیوہ ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں جا بجا ملتا ہے۔ سورۃ المطففین میں قیامت کے احوال میں اہلِ جنت اور اہلِ نار کے حوالے سے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔" اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ؗ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ؗ .... الخ " [1]

---

[1] ترجمہ:۔ مجرم لوگ دنیا میں اہلِ ایمان کا مذاق اڑاتے تھے، جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے تھے، اپنے گھروں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے اور جب مومنین کو دیکھتے تو کہتے " یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں "۔ حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں، مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں۔ مل گیا نا، کافروں کو ان کی حرکتوں کا ثواب جو وہ کیا کرتے تھے۔ (آیات ۲۹ تا ۳۶)

اہل حق کو دنیا داروں کے استہزا سے بے نیاز ہو کر اپنے خالق کے سامنے اپنا نامۂ اعمال پیش کرتے وقت خلوص و دیانت کے ساتھ اس کی بندگی کا ثبوت مہیا کرنا چاہیئے۔ اس نامۂ اعمال کے ساتھ اس سے مغفرت اور رحمت کی بھیک بھی مانگتے رہنا چاہیئے کہ اس کے بغیر اعمال کے بل بوتے پر کچھ بھی حصولِ خیر نہیں ہو سکتا۔

(۴۴)

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ ع (المومنون آیت: ۱۱۸)

"میرے رب، درگزر فرما اور رحم کر اور تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے۔"

یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سکھائی۔ اس دعا سے پہلے والی دعاؤں بھی الفاظ اس سے ملتے جلتے ہیں گویا تلقین کی جا رہی ہے کہ میرے مخصوص بندوں کی جس دعا کا ذکر قیامت کو میری زبانی ہوگا۔ تم وہی دعا کیا کرو۔ اس کی تشریح مرشد مودودی نے یوں کی ہے:-

"یہاں اس دعا کی لطیف معنویت نگاہ میں ہے۔ ابھی چند سطر اوپر یہ ذکر آ چکا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے دشمنوں کو معاف کرنے سے یہ کہہ کر انکار فرمائے گا کہ میرے جو بندے یہ دعا مانگتے تھے، تم ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو (اور ضمناً صحابہ کرام کو بھی) کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ٹھیک وہی دعا مانگو جس کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں۔ ہماری صاف تنبیہہ کے باوجود اب اگر یہ تمہارا مذاق اڑائیں تو گویا آخرت میں اپنے خلاف گویا خود ہی ایک مضبوط مقدمہ تیار کر دیں گے۔"

(تفہیم القرآن جلد سوم، المومنون حاشیہ ۱۰۷)

(۶۵)

رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ (الفرقان، آیت: ۶۴-۶۵)

"اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے، اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی برا ٹھکانہ اور بُری جگہ ہے۔"

یہ دعا عباد الرحمان (بندگانِ الٰہی) کی ہے۔ سورۃ الفرقان کا آخری رکوع اللہ نے اپنے بندوں کی صفات بیان کرنے کے لیے وقف کیا ہے۔ اس رکوع میں اللہ کے بندوں کا ذکر یوں شروع ہوتا ہے "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا ...." (اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ چلتے ہیں ......) اس کے بعد آگے ان کی ایک ایک صفت نہایت دلنشین پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ ان صفات کو پڑھنے سے عباد الرحمٰن کی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ اللہ کے احکام کے پابند اور ہر معاملے میں اس کی مرضی کے تابع نظر آتے ہیں۔ ان کو سوائے اللہ کے کسی سے نہ ڈر ہے نہ طمع۔ وہ ہر وقت اس زبردست ہستی کے سامنے عاجزی سے دستِ سوال پھیلائے اس کے کرم کے طالب رہتے ہیں۔ انہیں کبھی بھی اپنی نیک عملی و پرہیز گاری سے یہ غلط فہمی لاحق نہیں ہوتی کہ ان کا کھاتہ پاک صاف ہے اور وہ آنکھیں بند کر کے سیدھے جنت میں جا داخل ہوں گے۔ وہ اللہ کی رحمت کے متلاشی ہیں اور اسی کو ذریعہ نجات گردانتے ہیں۔

انہی عباد الرحمٰن کی زبانی یہ دعا یہاں نقل کی گئی ہے۔ وہ دوزخ کی صحیح کیفیت سے تعلیماتِ ربانی کی روشنی میں باخبر ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ دوزخ کا عذاب بڑا دردناک اور رسواکن ہے۔ وہ اپنے مالک سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ انہیں اس عذاب سے محفوظ رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کو جتنا زیادہ عرفانِ حق حاصل ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ خدا کے عذاب اور اس کی پکڑ سے ڈرے گا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بکثرت احادیث میں آتا کہ آپ آخرت کا ذکر کر کے نہایت مغموم ہو جایا کرتے تھے۔ دوزخ کی آگ سے بچنے کے لیے جس کثیر تعداد

میں ادعیۂ مسنونہ روایت کی گئی ہیں، اس سے بھی اس مسئلے کی اہمیت و شدت واضح ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کوئی بھی شخص رحمتِ ربانی کے بغیر محض اپنے اعمال سے دوزخ سے نہیں بچ سکتا۔" صحابہؓ نے پوچھا "وَلَا اَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ" تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ "وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ ایک باغ میں چڑیوں کو دیکھا تو بصد حسرت فرمایا۔ "اے کاش! ابوبکر چڑیا ہوتا تاکہ قیامت کے روز اسے خدا کے سامنے جوابدہ نہ ہونا پڑتا۔" بعض صحابہ تو آخرت کا تصور کر کے کانپ اٹھتے اور کہتے "کاش! مجھے میری ماں نے نہ جنا ہوتا۔" حضرت عمرؓ کا یہ قول تو مشہور ہے کہ آپ نے آخرت کا تذکرہ فرمایا پھر غمناک لہجے میں کہنے لگے۔ "اگر میں وہاں برابر سرابر چھوٹ جاؤں، خدا تعالےٰ نہ مجھے عذاب میں پکڑے اور نہ ہی جنت میں بھیجے تو بھی میں خوش قسمت ہوں گا۔" لَا لِیْ وَلَا عَلَیَّ"، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کے دل میں جنت کی خواہش نہ تھی بلکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوزخ سے کس قدر خائف تھے۔

عباد الرحمٰن کی یہ دعا بھی اسی معنی میں ہے۔ وہ اپنی ساری نیکیوں اور عبادتوں کے باوجود خائف رہتے ہیں کہ کہیں عمل کی کوتاہی انہیں مبتلائے عذاب نہ کر دے۔ وہ اپنے تقویٰ کے زور سے جنت جیت لینے کا پندار نہیں رکھتے بلکہ اپنی انسانی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے عذاب سے بچ نکلنے ہی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔

۶۶

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ۝ (الفرقان، آیت، ۷۴)

"اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے، اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔"

یہ بھی عبادالرحمان کی دعا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ "اے اللہ ہمارے اہل وعیال کو ہمارے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے۔" آنکھوں کی ٹھنڈک کا مفہوم یوں تو بڑا عام فہم ہے لیکن یہاں اس کے معانی کافی عمیق و دقیق ہیں۔ فطری طور پر تو انسان کے اہل وعیال اس کے لیے باعث سکون وطمانیت ہوتے ہی ہیں لیکن ایک بندۂ مومن کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک وہ اسی صورت میں ثابت ہو سکتے ہیں جبکہ ان کی زندگی کا مقصود ہی دینِ الٰہی کی سربلندی و سرفرازی ہو۔ وہ اگر ظاہری شکل وصورت سے حسین وجمیل اور طرزِ عمل کے لحاظ سے اس کے مطیع فرمان ہوں تو ایک دنیا دار آدمی کے اطمینان کے لیے یہ کافی سامان ہے۔ وہ اگر اس سے آگے سوچے گا تو زیادہ سے زیادہ اس کی پروازِ فکر یہاں تک پہنچے گی کہ وہ نہایت ذہین وفطین اور زندگی کے معاملات کو کامیابی سے چلانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ اس سے آگے اس کی نظر میں "آنکھوں کی ٹھنڈک" کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اس کے برعکس ایک دین دار آدمی کے لیے یہ ساری باتیں بھی اہمیت کی حامل ہوں گی، لیکن ان کی حیثیت اس کے نزدیک ثانوی ہوگی۔ اصل اہمیت وہ اس بات کو دے گا کہ اس کے یہ منظورِ نظر اہل وعیال خدا کے احکام کی کس قدر پابندی کرتے ہیں۔ وہ جس قدر زیادہ خلوص ومحبت کے ساتھ خدا کے فرماں بردار بندے بنیں گے اسی قدر زیادہ آنکھوں کی ٹھنڈک عبادالرحمن کو فراہم ہوگی۔

دعا کے دوسرے حصے میں عبادالرحمان اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انہیں پرہیزگاروں کا امام بنا دے۔

اس کا مطلب، عبادالرحمان کی صفات کو جو اسی مقام پہ بیان ہوئی ہیں، ذہن میں رکھنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ "اے اللہ ہمیں زیادہ سے زیادہ نیکی وتقویٰ کی توفیق بخش تاکہ ہم میدانِ عمل میں بہت زیادہ سرمایہ جمع کر سکیں۔" اس مفہوم کی گنجائش قرآن مجید کی سورۂ الملک کی ابتدائی آیات میں بھی ملتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے خلقِ موت وحیات کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ "لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا" (تاکہ وہ تمہارا امتحان لے کہ تم سے کون نیک اعمال میں آگے نکل جاتا ہے) اسی طرح قرآن مجید میں نیکی اور خیر کی

طرف جلدی بھاگنے اور مسابقت کی بھی ترغیب دی گئی ہے مثلاً "وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ......." (آل عمران) اس مفہوم کی متعدد آیات مذکور ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امامت متقین سے مراد یہی ہے کہ "اے اللہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ جذبہ و جوش اور قوتِ عمل کی توفیق بخش۔"

یہ اس کا ایک مفہوم ہے۔ دوسرا مفہوم جو اسی دعا کے الفاظ پر غور و خوض کرنے سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی اولاد اور اہل و عیال کے لیے دعا کرتا ہے کہ وہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہوں۔ وہ چونکہ ان کا سرپرست اور سردار ہے اس لیے اسے ان کی بھلائی مقصود ہے۔ سرپرست امام ہی ہوتا ہے اور جن کا وہ امام ہے ان کے لیے اس کی دعا ہے کہ وہ متقی و پرہیزگار ہوں نہ کہ بدکار و بداطوار۔ گویا وہ دعا کر رہا ہے کہ تو نے مجھے جن کا امام بنایا ہے ان کو متقی بنا۔ وہ متقی بنیں گے تو جبھی آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ثابت ہوں گے وگرنہ نہیں۔

اس آیت پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایک طرف اسلام طلب منصب سے منع کرتا ہے اور دوسری طرف یہاں عباد الرحمان خود ہی امامت کے طلبگار بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کا جواب اوپر کے دونوں مفہوم دے رہے ہیں۔ دراصل یہ اعتراض کرنے والے بزرجمہر نہ تو سیاق و سباق کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ ہی قرآن کے اسلوب سے واقف ہیں۔ ان کو بس امامت کا لفظ نظر آگیا اور انہوں نے جھٹ اعتراض جڑ دیا۔ فی الحقیقت یہاں جس امامت کا ذکر ہو رہا ہے وہ اس امامت سے مختلف ہے جس امامت میں سیاسی اقتدار کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اب اگر کسی شخص کو "رب البیت" کہا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم نے رَبّ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرا لیا ہے۔ یہ سمجھنے کی باتیں ہیں اور سمجھ میں ان لوگوں کے ہی آسکتی ہیں جو سمجھنے کے طلبگار ہوں۔

اس آیت کو بنیاد بنا کر بعض "مفتیانِ اسلام" اور "مفسرین قرآن"، کسی منصب کے لیے خود امیدوار بن جانے کے حق میں جواز ثابت کرتے ہیں۔ اسلام میں طلبِ اقتدار برائے ذات یا برائے مخصوص جماعت قطعاً حرام ہے۔ اسلام میں طلبِ اقتدار اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے نہ صرف جائز بلکہ فرض ہے اور اس کے معاملے میں سستی و غفلت سنگین

جرم ہے۔ اب اقتدار کو حاصل کرنے اور چلانے کے لیے انسان ہی کام کریں گے۔ اس لیے ان کو اقتدار سنبھالنا تو لازماً ہے لیکن وہ اقتدار اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق چلائیں گے تو طاغوت کے غلام ہوں گے اور اگر ذاتی خواہشات سے بالا رہ کر احکام ربانی کا نفاذ کریں گے اور محض خدا و رسول کے نمائندے بن کر رہیں گے تو عباد الرحمان ہوں گے۔ ان کے اس مقصد کے لیے طلبِ اقتدار کے احکام قرآن و سنت میں بکثرت موجود ہیں مگر یہاں اس آیت میں وہ مفہوم نہیں پایا جاتا کجا یہ کہ ذاتی امیدواری برائے حصولِ اقتدار کا جواز زبردستی نکال لیا جائے۔

(۶۷)

رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ ۝ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی ھٰرُوْنَ ۝ وَلَھُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۝ (الشعراء، آیات: ۱۲ تا ۱۴)

"اے میرے رب، مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلا دیں گے۔ میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں اور مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔"

یہ دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے جو آپ نے اس وقت مانگی تھی جب کہ آپ کو فریضۂ رسالت سونپا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ فرعون کے دربار میں جا کر اسے ہمارے احکام پہنچا دو۔ حضرت موسیٰؑ نے اس عظیم فریضہ اور بارِ گراں کا تصور کر کے اللہ کے سامنے مندرجہ بالا دعا پیش کی۔ تفصیلات سورۂ طٰہٰ کی دعاؤں میں گزر چکی ہیں۔

یہاں جس جرم کا ذکر کر کے حضرت موسیٰ نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ فرعون آپ کو قتل کرے گا وہ جرم وہی ہے جس کا تذکرہ سورۂ قصص میں بالتفصیل آیا ہے یعنی آپ نے مصر میں قیام دوران ایک مصری کو جو ایک اسرائیلی پر ظلم ڈھا رہا تھا گھونسہ مارا جس سے وہ مر گیا۔ پھر اس کے بعد آپ چھپتے چھپاتے مدین پہنچ گئے تھے۔ مدین کے سفر سے پہلے آپ کو اطلاع

ملی تھی کہ فرعون اور اس کے سردار آپ کو قتل کرنے کی سازشیں تیار کر رہے ہیں۔ اب آپ اپنی دعا میں یہی بات کہتے ہیں کہ یا اللہ مجھے ایک تو وہ جھٹلا دیں گے، اور میں زیادہ پُرجوش انداز میں ان کے سامنے پیغام پیش بھی نہیں کر سکوں گا۔ اور پھر میں نے تو ان کا آدمی قتل کیا ہوا ہے کہیں مجھے اس کے بدلے میں جاتے ہی پکڑ کر قتل نہ کر دیں اور یہ فریضۂ نبوت ادا ہی نہ ہو سکے، اس لیے ہارون کی طرف رسالت بھیجیں۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہاری مدد کے لیے ہارون کو بھی کارِ نبوت میں شامل کر دیا ہے اور رہا فرعون اور اس کے درباریوں کا معاملہ تو سن لو وہ تمہارا بال بیکا نہ کر سکیں گے۔ اور پھر جب موسیٰ علیہ السلام لگا یک دربارِ شاہی میں جا کھڑے ہوئے تو کسی نے بھی ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کی۔ انہوں نے کھلم کھلا فرعون کی خدائی کو چیلنج کیا اور ایک اللہ کی حاکمیت کا نعرہ لگایا۔ فرعون سے کافی طویل بحث بھی ہوئی مگر اس پر حضرت موسیٰؑ کا ایسا رعب طاری ہو گیا کہ وہ آپ کے خلاف کچھ نہ کر سکا۔ اس نے آپ کے قتل کا ذکر بھی کیا مگر اسے یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس قتل کی بناء پر آپ کے قتل کا فیصلہ صادر کر دیتا۔ یہ اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کی کھلی نصرت تھی۔ اسی کو قرآن "سلطانِ مبین" کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔

۶۹

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۝ وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ۝ وَاجْعَلْنِي مِن وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ۝ وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ۝ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ۝ يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝

(الشعراء۔ آیات: ۸۳ تا ۸۹)

"اے میرے رب، مجھے حکم عطا کر اور مجھ کو صالحین کے ساتھ ملا اور بعد کے آنے

والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر۔ اور مجھے جنتِ نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف فرما دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے۔ اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔"

یہ دعا حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی ہے۔ آپ نے اس دعا میں سب سے پہلا سوال بارگاہِ خداوندی میں یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حکم عطا کرے۔ حکم سے مراد فہم و فراست، تفقہ اور علم و حکمت ہے۔ اللہ کے احکام کو سمجھنے کے لیے جس سمجھ اور علم کی ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ نے وافر مقدار میں اپنے انبیاء کو دیا ہوتا ہے مگر پھر بھی علم کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اس لیے حضرت ابراہیم یہ درخواست پیش کرتے ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی دعا اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم کو سکھائی "رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً"، اس کا تذکرہ سورۂ طٰہٰ کی دعاؤں میں گزر چکا ہے۔ دوسرا سوال آپ نے یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صالحین کے ساتھ شامل کرے۔ اس سے آخرت میں صالحین میں شمولیت تو مراد ہے ہی مگر دنیا میں بھی صالح معاشرے کے میسر آنے کا مفہوم اس دعا میں پایا جاتا ہے۔ ایک نیک آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف خود نیکی پر کاربند رہے بلکہ اس کے گردو پیش ہر جانب نیکی اور بھلائی کی کھیتی پھلتی پھولتی نظر آئے۔ وہ بُرے لوگوں اور گندے معاشرے سے سخت گھبراتا ہے کیونکہ یہ گندگی اس کے پاک و صاف دامن کو بھی داغدار کر سکتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ نیکی صرف یہی ہے کہ آدمی برے لوگوں سے منہ موڑ کر اپنا دامن بچانے کی خاطر گوشہ نشین ہو جائے بلکہ سعیِ اصلاحِ معاشرہ کے ساتھ یہ خواہش رکھنا کہ لوگ واقعتہً اصلاح قبول کر لیں اور مصلحین کی ایک جماعت ایسی مل جائے جو برائی کے مقابلے پر سہارا بنے، مقصود و مطلوب ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے اس دعا کے بعد بگڑے ہوئے معاشرے سے نجات دی اور جب آپ ہجرت کر کے اپنے ملک سے نکل گئے تو اچھے لوگوں کا ساتھ آپ کو نصیب ہوا اگرچہ وہ تعداد میں کم ہی تھے۔

تیسری دعا آپ نے یہ فرمائی کہ آپ کو بعد میں آنے والوں میں سچی ناموری ملے! اس ناموری سے مراد دنیوی شہرت نہیں ہے بلکہ وہ ناموری مراد ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے دین کی خاطر کٹھن آزمائشیں جھیل کر حاصل کی۔ اس دعا میں آپ اللہ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ کے مشن کو زندہ رکھا جائے تاکہ بعد میں آنیوالے آپ کی مثال سے نیکی اور بھلائی کی طرف سبقت کریں۔ آپ کی اس دعا کا نتیجہ دیکھئے کہ دنیا میں سب سے زیادہ آبادی ان لوگوں کی ہے جو آپ کی ناموری کو مانتے ہیں۔ (یہ الگ بحث ہے کہ وہ فی الحقیقت آپ کی تعلیمات پر کاربند بھی ہیں یا نہیں) وہ حسنِ عقیدہ اور حسنِ عمل پر بھی قائم ہیں۔ یہی سمجھتے ہیں کہ دراصل یہ دینِ ابراہیمی ہے۔

چوتھا سوال آپ نے یہ کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جنتِ نعیم کے وارثا میں شامل کرے۔ جنتِ نعیم بہشت کی ایک منزل ہے جس میں نعمت ہائے ربانی کی بہتات ہے۔ جنت کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بڑی ترغیب دی ہے۔ علاوہ ازیں سورہ آل عمران میں فرمایا ہے کہ اصل کامیابی تو یہ ہے کہ آدمی دوزخ کی آگ سے بچا لیا جائے اور جنت میں اسے داخلے کی اجازت مِل جائے۔ "فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ط"

آپ نے یہاں دخولِ جنت کی جو دعا کی ہے دراصل یہ عظیم الشان کامیابی کی دعا ہے جو آپ نے مانگی۔ اسی کو قرآن نے سورہ بروج میں الفوز الکبیر اور سورہ صفٰت میں الفوز العظیم کہا ہے۔

پانچویں سوال میں آپ نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کی ہے۔ شروع میں آپ نے یہ دعا فرمائی تھی مگر بعد میں جب اللہ نے حکم دیا کہ کافر کے لیے دعا نہیں مانگی جا سکتی تو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے حق میں دعا مانگنی چھوڑ دی۔ سورۂ توبہ میں اس کا ذکر یوں ہے "فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ط[1]" سورۂ ابراہیم کی دعاؤں میں بھی یہ واقعہ آ چکا ہے۔

چھٹا سوال آپ نے یہ کیا ہے کہ قیامت کے دن آپ کو رسوا نہ کیا جائے۔ قیامت

---

[1] ترجمہ: جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا۔ (آیت ۱۱۴)

کے دن اللہ کے بندوں اور شیطان کے بندوں کی الگ الگ جماعتیں ہوں گی۔ قرآن مجید ان کو اصحاب النار اور اصحاب الجنۃ (سورۃ الحشر) حزب الشیطان اور حزب اللہ (سورۃ مجادلہ) مجرمین اور مومنین (مطففین) کافرین اور متقین (الزمر) وغیرہ کے نام سے یاد کرتا ہے پہلے گروہ سے یہ کہا جائے گا۔ "وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ" (سورۃ یٰس آیت ۵۹) یعنی اے مجرمو آج تم صالحین سے الگ ہو جاؤ۔ تمہارا انجام ان سے مختلف ہے۔ ان دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ کے چہروں پر لعنت اور پھٹکار ہوگی اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے کہ بدعملیاں ظلمات ہی کے مترادف ہیں۔ دوسرے گروہ کے چہروں پر بشاشت اور رونق ہوگی اور ان کے چہرے چمکتے ہوں گے کہ نیکی و تقویٰ نور کے مترادف ہے۔ پہلے گروہ کی رسوائی میں کسی کو شک نہ ہوگا اور دوسرے گروہ کی عزت افزائی ڈھکی چھپی نہ ہوگی۔ حضرت ابراہیم کی اس دعا کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس دن مجھے رسوائی سے بچانا اور ان لوگوں میں شامل کرنا جن کو تو نے کہا ہے، "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ"۔

پھر آخر میں آپ اس دن کی ہولناکی کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اے مولا! اس دن مال اور اولاد کسی کو نفع نہ پہنچا سکیں گے۔ اس دن تو وہی کامیاب رہے گا جو قلبِ سلیم کے ساتھ حاضرِ دربار ہوگا۔ (تو تو مجھے قلبِ سلیم عطا کر)"

(۶۹)

رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ۝ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَنَجِّنِي وَمَن مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (الشعراء، آیات: ۱۱۷-۱۱۸)

"اے میرے رب، میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ اب میرے اور ان کے درمیان دو ٹوک فیصلہ کر دے اور مجھے اور میرے ساتھی مومنین کو نجات دے۔"

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا ہے جو آپ نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کرنے کے بعد مانگی تھی۔ آپ کی قوم نے آپ کو آغازِ رسالت سے ہی جھٹلایا تھا مگر یہ جھٹلانا جس کا

ذکر اس دعا میں کیا جا رہا ہے آخری اور قطعی تکذیب کے معنوں میں ہے، یعنی اب ان کے قبول حق کی کوئی امید اور گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس دعا کے وقت حالت یہ ہو چکی تھی کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے آپ کو دھمکی دے دی تھی کہ اگر انہوں نے تبلیغ اسلام کا کام بند نہ کیا تو انہیں سنگسار کر دیا جائے گا[1] آپ کی اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا اور آپ کو آپ کے صحابہ سمیت بچا لیا۔ باقی پوری قوم غرق طوفان کر دی۔ واقعات پہلے گزر چکے ہیں۔

(۷۰)

رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ○ (الشعرآء، آیت: ۱۶۹)

"اے پروردگار، مجھے اور میرے اہل وعیال کو ان کی بدکرداریوں سے نجات دے۔"

یہ دعا حضرت لوط علیہ السلام کی ہے۔ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور ہجرت ابراہیمی سے پہلے آپ نے اور حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم کو نبی مانا تھا۔ باقی پوری قوم نے انکار کیا۔ ہجرت میں بھی یہ دونوں آپ کے ساتھ تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو نبوت کے منصب پر سرفراز فرمایا اور شرق اردن کے علاقے میں آپ کو تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا گیا۔ یہ قوم بڑی بدکردار اور فسادی تھی۔ ان لوگوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ ان کے حالات لکھے ہیں۔ جو حضرات تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں وہ سورۂ الاعراف آیات ۸۰ تا ۸۴، ہود ۷۴ تا ۸۳، الحجر ۵۷ تا ۷۷، الانبیاء ۷۱ تا ۷۵، الشعرآء ۱۶۰ تا ۱۷۵، النمل ۵۴ تا ۵۸، العنکبوت ۲۸ تا ۳۵، الصافات ۱۳۳ تا ۱۳۸، القمر ۳۳، ۳۹، تحریم ۱۰ کا مطالعہ فرمائیں۔

---

[1] قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ○ (الشعرآء، آیت ۱۱۶)
انہوں نے کہا "اے نوح، اگر تو باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر دیا جائے گا۔"

ان لوگوں نے جنسی تسکین کے لیے اللہ کے مقرر کردہ قاعدے کو چھوڑ کر خلاف فطرت کام شروع کر دیا۔ یہ بری رسم اور قبیح روایت اس بدبخت قوم نے ایسی ڈالی کہ آج تک اس فعل کو عمل قوم لوط یا لواطت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لواطت کا لفظ استعمال کرنا سخت گناہ ہے کیونکہ اس کی نسبت ڈائریکٹ حضرت لوط سے ہو جاتی ہے نہ کہ قوم لوط سے۔ میرے نزدیک ہم جنسی کے لیے لواطت کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے اس قوم کو اس گناہ پر بار بار ٹوکا اور شرم دلائی کہ خلاف فطرت کام کرنے کے لیے دوڑے پھرتے ہیں اور فطری راستہ (بیویوں سے ہم بستری) چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر اس قوم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ حضرت لوط کے ہاں جب فرشتے لڑکوں کی شکل میں عذاب فیصلہ ربانی روبہ عمل لانے کے لیے آئے تو اس قوم نے انہیں سچ مچ لڑکے سمجھ کر حضرت لوط علیہ السلام کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت لوط اس صورت حال سے سخت پریشان ہوئے اور کہا "میرے مہمانوں میں مجھے رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی شریف آدمی نہیں ہے؟" مگر ان بدبختوں کو اس بات کا کوئی احساس نہ تھا کہ عذاب ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے ان کے بارے میں تو قرآن کہتا ہے: "لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ۝" (الحجر، آیت ۷۲) (اے محمدؐ تیری عمر کی قسم وہ تو نشے میں اندھے ہو چکے تھے)۔

میں جب حضرت لوط علیہ السلام کے حالات کا مطالعہ کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ آنجناب کا کام نہایت کٹھن تھا۔ ایک نہایت بدکردار اور پرلے درجے کی بے شرم قوم کے اندر فریضہ رسالت ادا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس قوم کی بے شرمی و بے حیائی تو ان کے اس فعل سے عیاں ہے لیکن اس پر مستزاد یہ کہ وہ بھری محفلوں میں بھی اس فعل سے باز نہ آتے تھے "وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ" (العنکبوت، آیت: ۲۹) یعنی تم اپنی مجلسوں میں برائی کرتے ہو۔

حضرت لوط علیہ السلام ہمیشہ اس قوم کی غلط کاریوں پر اسے ٹوکتے رہتے۔ وہ لوگ کہتے "أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِّن قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ" (النمل آیت ۵۶) (لوط اور اس کے گھر والوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ وہ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں) یہاں بھی وہ حضرت لوطؑ

کو دھمکی دیتے ہیں۔ "لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ" اس کے جواب میں آنجناب فرماتے ہیں "اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ" یعنی میں تمہارے کرتوتوں پر تمہیں ٹوکتا ہی رہوں گا کیونکہ یہ بُرے اعمال مجھے سخت ناپسند ہیں[1]۔ اس کے بعد آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں کہ "یا اللہ مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان کی بدکرداریوں سے نجات دے" اس دعا سے دو مفہوم نکلتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جو بداعمال اس قوم نے اختیار کر رکھے ہیں اور جو روز افزوں ہیں ان کی چھوت چھات سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو محفوظ رکھ۔ دوسرا یہ کہ ان لوگوں کے اعمالِ بد کی وجہ سے جو عذاب ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے اس میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو محفوظ رکھ۔ دوسرا یہ کہ ان لوگوں کے اعمالِ بد کی وجہ سے جو عذاب ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے اس میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی نہ پیس ڈالنا بلکہ ہمیں اس سے نجات دینا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کی۔ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اس گندے معاشرے کی گندگیوں سے پاک صاف رکھا اور جب اس قوم پر عذاب نازل کیا تو اس سے بھی آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نجات ملی۔ آپ کی ایک بیوی جو کافروں کے ساتھ تھی وہ نہ بچ سکی۔ وہ اس عذاب میں قوم کفّار کے ساتھ تباہ کر دی گئی۔ جس عذاب میں یہ لوگ تباہ ہوئے وہ بڑا دردناک اور عبرت انگیز عذاب تھا۔ اس بڑی قوم کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی پتھروں کی بارش برسا کر سنگسار کر دیا۔

یا اللہ ہم تیری پناہ مانگتے ہیں بُرے اعمال سے اور ان کے بُرے انجام سے۔

۷۱

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَ

---

[1] (الشعراء آیت ۱۶۷ و آیت ۱۶۸)

اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (النمل، آیت : ۱۹)

"اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیرے ان احسانات کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیے ہیں اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندگان میں شامل کر۔"

یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا ہے۔ یہ حضرت سلیمانؑ حضرت داؤد علیہ السلام کے فرزند تھے اور انجناب کے بعد نبوت اور حکومت کے وارث بنائے گئے۔ "وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ"[1] اور "وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَیْمٰنَ"[2] سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام جیسے عظیم المرتبت پیغمبر اور ذی شان شہنشاہ کے جانشین تھے اور حضرت داؤد کو اللہ تعالٰے نے سلیمان جیسا صاحب عزّ و شرف اور مالکِ سطوت و شوکت فرزند عنایت فرمایا تھا۔ باپ کی ذات سے بیٹے کی نسبت باعث افتخار تھی اور بیٹے کی ذات سے باپ کا رشتہ موجب توقیر تھا۔

حضرت سلیمان نے یہ دعا خدا کے حضور اس وقت مانگی تھی جبکہ آپ کے عظیم الشان لشکر کو دیکھ کر ایک چیونٹی نے اپنی ہم جنس چیونٹیوں سے کہا تھا کہ "اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور اس کا لشکر بے علمی میں تمہیں کچل ہی نہ ڈالے۔" آپ نے چیونٹی کی بات سن لی اور سمجھ لی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر بہت بڑا احسان تھا کہ اس نے آپ کو ایک جانب نبوّت کے بلند مقام پر سرفراز کیا تھا جو دنیا میں سب سے اونچا مقام ہو سکتا ہے دوسری طرف آپ کو ایسی حکومت عطا کی تھی جس کی کوئی مثال نبی نوع آدم میں نہیں ملتی تیسری طرف آپ کو تمام مخلوقات کی باتیں سننے اور سمجھنے کی صلاحیت بخشی گئی تھی۔ یہ بہت بڑی بڑی نعمتیں تھیں، ان کو یاد کر کے آپ نے مندرجہ بالا دعا مانگی تھی۔

---

[1] ترجمہ:۔ اور سلیمانؑ داؤد کا وارث ہوا۔ (سورہ النمل آیت : ۱۶)

[2] ترجمہ:۔ اور ہم نے داؤد کو سلیمان (جیسا فرزند) عطا کیا۔ (سورہ ص، آیت ۳۰)

آپ کی حکومت جن و انس کے علاوہ پرندوں، درندوں اور چرندوں پر بھی تھی بلکہ ہوا بھی آپ کی حکومت میں دے دی گئی تھی۔ جب آپ کا لشکر جرار ایک مہم پر روانہ ہوا تو اس میں جن و انسان اور پرندے شامل تھے۔ یہ لشکر چلا جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک جگہ چیونٹیوں کے بل آ گئے۔ چیونٹیوں کی سردار چیونٹی نے لشکر سلیمان کو آتے ہوئے دیکھا تو سوچا کہ کہیں یہ لشکر چیونٹیوں کو بے توجہی میں کچل نہ ڈالے۔ پس وہ از راہِ احتیاط اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ وہ سب بلوں میں گھس جائیں۔ حضرت سلیمان یہ بات سن رہے تھے، آپ مسکرا دیئے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کس قدر عظیم الشان انعامات خدا تعالیٰ نے آپ پر اور آپ کے والدین پر کیے تھے۔ یہ خیال آتے ہی پیغمبر خدا نے اپنا سر حضورِ اقدس میں جھکا دیا اور التجا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی توفیق دے اور اعمالِ صالح کی ہمت بخشے نیز آخرت میں اپنے نیک برگزیدہ بندوں میں شامل کرے۔

ہر انسان پر خدا نے بے شمار نعمتیں کی ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے "اِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (اگر تم خدا کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے) انسان کا فرض ہے کہ ان لاتعداد نعمتوں کو یاد کر کے خدا کا شکر ادا کرے اور یہ دعا پڑھتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احقاف میں اپنے مخصوص بندوں کی جو دعا نقل کی ہے وہ حضرت سلیمان کی اس دعا سے بہت ملتی جلتی ہے۔ تھوڑا سا لفظی تغیر ایک جگہ ہے۔ وہ دعا آگے آ رہی ہے۔

(۷۲)

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (النمل، آیت: ۴۴)

"اے میرے رب میں نے (آج تک) اپنے آپ پر بڑا ظلم کیا، اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔"

یہ ملکۂ سبا کی دعا ہے جو اس نے اس وقت مانگی جبکہ اس نے اسلام قبول کیا۔ ملکۂ سبا

قومِ سبا کی حکمران تھی۔ یہ قوم ایک طویل عرصہ تک یمن اور جنوبی عرب کے علاقوں پر قابض رہی۔ یمن کے موجودہ دارالحکومت صَنعَا سے ۵۵ میل شمال مشرق میں مارب کا شہر اس قوم کا صدر مقام تھا۔ تجارت اور زراعت کی وجہ سے اس قوم میں دولت کی خوب ریل پیل تھی۔ حِمیَر کے عروج ۱۱۵ ق م تک اس قوم نے بڑے دبدبے سے حکومت کی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں اس سلطنت پر ایک عورت کی حکومت تھی۔ یہ ملکہ اور اس کی قوم سورج کی پرستش کرتی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہدہد پرندے نے یہ اطلاع دی کہ ملکۂ سبا اپنی ساری قوم سمیت خدائے وحدہٗ لاشریک کو چھوڑ کر آفتاب پرستی کی لعنت میں مبتلا ہے۔ حضرت سلیمان نے اسی ہدہد کے ذریعے ایک خط ملکۂ سبا کے نام لکھا۔ ہدہد نے خط ملکۂ سبا کے سامنے اس وقت پھینک دیا جبکہ وہ سورج پرستی کے لیے معبد کی جانب جا رہی تھی۔ خط میں لکھا تھا :۔

"یہ مکتوب سلیمان کی طرف سے ہے اور اللہ رحمان و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ میرے مقابلے پر سرکشی نہ کرو اور مسلم و مطیع بن کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔"

ملکہ یہ خط پڑھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے فوراً مجلس مشاورت طلب کی اور معاملہ مجلس کے سامنے رکھ دیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ بحث و تمحیص کے بعد طے ہوا کہ حضرت سلیمان کی خدمت میں تحائف بھیجے جائیں اور ان ایلچیوں کے آنے کا انتظار کیا جائے کہ وہ کیا جواب لیکر لوٹتے ہیں۔ ادھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان تحائف کو دیکھا تو فرمایا "ان تحائف کی تو ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ خدا نے ہمیں اس سے بہت زیادہ انعامات سے نواز رکھا ہے۔ جاؤ یہ سب کچھ لے جاؤ۔ اگر اسلام قبول نہیں تو ایک عظیم الشان لشکر کا انتظار کرو جس کا مقابلہ کرنے کی تم میں طاقت نہیں ہے۔" حضرت سلیمان کو مال و دولت کی کوئی بھوک نہ تھی، وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ یہ قوم غلط راستہ چھوڑ کر رہِ ہدایت اختیار کرلے۔

اس کے بعد آپ نے ملکۂ سبا کا تخت ایک معجزانہ طریقے سے اپنے دربار میں منگوالیا۔ (اس کی تفصیلات سورۂ نمل میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں) ادھر ملکہ بنفسِ نفیس دربارِ سلیمانی میں

حاضری کے لیے چل دی۔ جب وہاں پہنچی اور اپنا تخت موجود پایا تو حیران رہ گئی۔ اس کے بعد اس کے دل نے گواہی دی کہ سلیمان دنیا کے بادشاہوں کی طرح محض بادشاہ نہیں ہے بلکہ وہ فی الواقع اللہ کا پیغمبر ہے تو وہ ایمان لے آئی۔ ایمان لانے کے موقع پر اس نے یہ الفاظ کہے جن میں بظاہر دعائیہ کلمات نہیں ہیں لیکن مفہوم دعا موجود ہے کیونکہ اسے اپنی گزشتہ بت پرستی کی زندگی پر شدید احساسِ ندامت تھا جسے وہ ان الفاظ میں حضور ربانی میں پیش کرتی ہے۔ "اے میرے مولا! میں نے آج تک غلط روش اختیار کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ اور اب میں متنبہ ہوئی ہوں تو فوراً سلیمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا ہے" (لہٰذا میرے گزشتہ گناہوں کی معافی فرمائی جائے)

یہ دعا حضرت یونس علیہ السلام کی دعا کے مشابہ ہے جس میں آنجناب نے کہا تھا" لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ"

ملکۂ سبا کے بارے میں مسلمانوں میں عجیب و غریب داستانیں مشہور ہیں۔ یہ سب داستانیں اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں اور اکثر قرآن کے بالکل خلاف ہیں۔ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سے شادی کر لی تھی۔ قرآن و حدیث اس بارے میں خاموش ہیں۔ ممکن ہے آپ نے شادی کر لی ہو لیکن یہ بات یقینی نہیں ہے۔

۷۳

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ ۝ (القصص آیت: ۱۶)

"اے میرے رب، میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرما دے۔"

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے جو آپ نے اس وقت مانگی تھی۔ جب آپ کے ہاتھوں غیر ارادی طور پر ایک قبطی قتل ہو گیا تھا۔ سورہ القصص میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جب ہوش سنبھالا اور جوانی میں داخل ہوئے تو مصر کی حالت ان کے لیے نہایت اذیت کا باعث تھی۔ آپ تو دربار شاہی میں پروان

چڑھنے کی وجہ سے شہزادوں کی سی پرآرام کی زندگی گزارتے تھے لیکن بنی اسرائیل مجموعی طور پر حد درجہ تکلیف میں مبتلا تھے۔ مصر کی حکمران قبطی قوم اس غلام قوم کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتی تھی۔ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہر میں دیکھا کہ ایک قبطی اور ایک اسرائیلی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی اور آدمی نہ تھا۔ اسرائیلی نے موسیٰ کو دیکھتے ہی مدد کے لیے پکارا۔ آپ نے قبطی کو ایک گھونسا مار دیا۔ آپ کا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہ تھا لیکن قضائے الٰہی سے وہ گھونسا اس کے لیے پیغامِ اجل بن گیا اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ یہ صورتِ حال تشویشناک تھی حضرت موسیٰ کو اپنے اس فعل پر سخت ندامت تھی۔

آپ نے سمجھا کہ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل جو بے چارے پہلے ہی کچھ کم مظلوم نہ تھے مزید ظلم و ستم کی چکی میں پسنے لگیں گے۔ آپ کے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ یہ سب کچھ شیطان کی چال ہے۔ آپ اسی وقت خدا کے سامنے جھک گئے اور عرض کیا۔ "اے مولا میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے تو میرا گناہ معاف کر دے۔"

اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف فرما دیا اور وہ تو بہت معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ خدا کی جانب سے معافی مل جانے کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ چونکہ اس نے ان کو معافی دے کر ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے لہٰذا وہ کبھی ظالموں کے معاون نہیں بنیں گے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے دربار شاہی سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ مفسرین نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ظالم حکومت یا افراد کی معاونت ہرگز کسی مومن کو نہیں کرنی چاہیے[1] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن جلد سوم میں آیاتِ متعلقہ کی تفسیر میں لکھا ہے۔

"حضرت عطا بن ابی رباح سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ میرا بھائی بنو امیہ کی حکومت میں کوفے کے گورنر کا سیکرٹری ہے۔ معاملات کے فیصلے کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ البتہ جو فیصلے کیے جاتے ہیں وہ اس کے قلم سے جاری ہوتے ہیں۔ یہ نوکری وہ نہ کرے تو

---

[1] سورۃ القصص آیت : ۱۷

مفلس ہو جائے۔ حضرت عطاء نے جواب میں یہی آیت پڑھی اور فرمایا "تیرے بھائی کو چاہیے کہ اپنا قلم پھینک دے رزق دینے والا اللہ ہے۔"

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۶۲۳ - ۶۲۴)

(۷۴)

رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (القصص، آیت: ۲۱)

"اے میرے رب مجھے ظالموں کی قوم سے نجات دے۔"

یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے۔ قبطی کے قتل کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ آئندہ وہ ظلم کے کاموں میں معاون نہیں ہوں گے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ نعوذ باللہ حضرت موسیٰؑ پہلے ظلم کے کاموں میں بالفعل معاونت کرتے تھے بلکہ اصل مطلب یہ تھا کہ دربارِ شاہی سے تعلق کی وجہ سے خود بخود شاہی مظالم میں وہ خود کو شریک سمجھنے لگے تھے اور آئندہ کے لیے آپ نے یہ تعلق منقطع کر لینے کی ٹھانی تھی۔ آپ شہر میں ڈرتے ڈرتے پھر رہے تھے کہ کہیں گزشتہ روز کے قتل کی وجہ سے آپ پکڑے نہ جائیں۔ اسی دوران آپ نے دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل قبطی سے دست و گریباں تھا آج ایک دوسرے قبطی کے ساتھ جھگڑ رہا ہے۔ اس نے آپ کو مدد کے لیے آواز دی۔ آپ اس کی مدد کو تو آگے بڑھے لیکن اسے بھی تنبیہہ کی اور فرمایا "تو تو بڑا بہکا ہوا آدمی ہے۔" وہ سمجھا شاید آج موسیٰؑ مجھ پر ہاتھ اٹھائے گا۔ اس نے پہلے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ "موسیٰ تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے جس طرح کل تو نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا......" اس کے اس واویلے سے گزشتہ روز کے قتل کی خبر عام پھیل گئی کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا ہے۔

اسی دوران سرداران دربار انگاروں پر لوٹنے لگے کہ نوجوان شہزادے نے جس کے بارے میں انہیں علم تھا کہ اصلاً اس کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے، ایک اسرائیلی کی حمایت

یں حکمران قوم کے ایک فرد کو قتل کر ڈالا ہے۔ انہوں نے آپس میں مشورے شروع کر دیئے کہ موسیٰؑ کو قتل کر دیا جائے۔ یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور اس نے نہایت رازداری اور ہمدردی سے حضرت موسیٰؑ کو بتایا کہ ان کے قتل کے لیے عمائدین حکومت بہت بے تاب ہیں۔ پھر اس نے مشورہ دیا۔ "فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَکَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ" یعنی شہر سے نکل جائیے میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔

حالات بڑے خطرناک تھے۔ حضرت موسیٰ کو پورے ملکِ مصر میں کوئی جگہ بھی محفوظ نظر نہ آ رہی تھی۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ اس ملک کو خیر باد کہہ کر کہیں اور نکل جائیں۔ خدا کی زمین پر کوئی جگہ تو انہیں ایسی مل جائے گی جہاں وہ پناہ لے سکیں۔ یہ حالات تھے جب کہ آپ ڈرتے ڈرتے شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی۔ "اے میرے مولا مجھے ظالموں سے نجات دے۔"

اس دعا کے بعد آپ نے مدین کا رُخ کیا اور نہایت پُر امید لہجے میں کہنے لگے۔ "امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا۔" یہ سفر آپ نے تن تنہا طے کیا اور مصر سے مدین جا پہنچے۔ خدا نے آپ کی دعا سن لی اور نہ صرف آپ کو ظالم قوم سے نجات دی بلکہ اس عظیم انقلاب کے لیے راہ ہموار کر دی جس کی بدولت چند سالوں تک تمام بنی اسرائیل کو ظالم قوم سے نجات ملنے والی تھی۔

ظالموں اور ہٹ دھرم منکرینِ حق سے جب کسی بندۂ مومن کو واسطہ پڑ جائے تو اسے یہ دعا کرنی چاہیے۔ خلوص دل سے کی ہوئی دعا ظالموں کے ہتھکنڈوں اور سازشوں کے مقابلے پر اہلِ حق کو نجات بخش دے گی۔

۷۵

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ○ (القصص، آیت: ۲۴)

"پروردگار، جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے، میں اس کا محتاج ہوں۔"

یہ بھی حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی دعا ہے۔ جب آپ مدین پہنچے تو آپ نے پانی کا ایک

کنواں دیکھا۔ وہاں لوگ اپنی بھیڑ بکریوں اور دیگر مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ دو لڑکیاں اپنی بکریوں کو روکے کھڑی تھیں۔ بکریاں پیاس کے مارے پانی کی طرف دوڑتی تھیں مگر یہ ان کو روکتی تھیں۔ حضرت موسیٰ نے ان سے پوچھا ”تمہیں کیا پریشانی ہے۔“ انہوں نے جواب دیا کہ ہم خود تو کنوئیں سے پانی نہیں نکال سکتیں اور ہمارے والد بہت عمر رسیدہ ہیں اس لیے جب یہ لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں تو بچا کھچا پانی ہم اپنی بکریوں کو پلا لیتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے ان کی بکریوں کے لیے پانی کھینچا اور انہیں پلایا۔ پھر آپ ایک درخت کے سائے میں جا کر بیٹھ گئے۔ غربت و مسافرت اور آٹھ دس دنوں سے بھوکے پیاسے ۔ کیا بے چارگی کا عالم تھا۔ اس وقت آپ نے یہ دعا مانگی۔

یہ دعا مانگنے کے تھوڑی دیر بعد ان لڑکیوں میں سے ایک شرماتی ہوئی آپ کے پاس آئی اور کہا کہ ”چلیئے میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ کو پانی پلانے کا اجر دیں۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ سخت ضرورت اور شدید اضطرار میں تھے اس لیے اس لڑکی کے ساتھ چل دیئے۔ پھر انہوں نے شیخ کے گھر جا کر شیخ سے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ شیخ نے پوری داستان سن کر فرمایا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تو نے ظالموں سے نجات پا لی ہے۔“

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ علیہ السلام اور شیخ کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ آپ شیخ کی خدمت آٹھ سال تک کریں اور شیخ اپنی ایک لڑکی ان کے عقد میں دے دے گا۔ یہ معاہدہ طے پا گیا اور حضرت موسیٰؑ علیہ السلام آٹھ سال پورے کرنے کے بعد مزید دو سال اپنی مرضی سے شیخ کی خدمت کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ اپنی بیوی کو لیکر مدین سے مصر کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی سفر میں آپ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔

یہ شیخ مدین کون تھے؟ بعض لوگوں نے انہیں حضرت شعیب بتایا ہے۔ حضرت شعیب بلاشبہ مدین کے علاقے میں ہی مبعوث ہوئے تھے لیکن قرآن مجید میں ان کے حالات و واقعات ان کے نام کے ساتھ تفصیلاً کئی جگہوں پر منقول ہوتے ہیں۔ اگر یہ حضرت شعیب ہوتے تو ان کا نام لے کر بتایا جاتا۔ لہٰذا یہ حضرت شعیب نہیں تھے۔ کچھ لوگوں نے ان کا نام

عوائل اور بیتھرو بیان کیا ہے۔بہر حال ان میں سے جو بھی نام تھا، شیخ کے کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ دینِ ابراہیمی کے پیروکار تھے اور آپ کی زندگی خدا کی اطاعت کے لیے وقف تھی۔حضرت حسن بصری کے حوالے سے سید مودودی نے بتایا کہ شیخ مسلمان آدمی تھے جنہوں نے حضرت شعیب کا دین قبول کر لیا تھا۔وہ بت پرستی کے مخالف تھے اس لیے اہلِ مدین ان کے مخالف ہو گئے تھے۔

انسان بے شمار حاجات کے لیے محتاج رہتا ہے۔اسے مشکل وقت میں خدا تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہیئے۔سفر میں اور تنہائی میں جہاں کوئی جان پہچان والا نہ ہو بسا اوقات اس دعا نے (تجربۃً) بڑے خوشگوار نتائج پیدا کیے ہیں۔

(۷۶)

رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ○ وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ○ (القصص، آیت:۔ ۳۳-۳۴)

"میرے آقا، میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں۔ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھے وہ قتل نہ کر ڈالیں۔اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج دو، تاکہ وہ میری تائید کرے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔"

یہ دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعطائے نبوت کے وقت مانگی تھی۔اس کا تذکرہ پہلے کی دعاؤں میں گزر چکا ہے۔

(۷۷)

رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ ○ (العنکبوت، آیت: ۳۰)

"اے میرے رب، ان مفسد لوگوں کے مقابلے پر میری مدد فرما۔"

یہ دعا حضرت لوط علیہ السلام کی ہے۔ آپ کی قوم میں حد درجہ اخلاقی پستی پائی جاتی تھی ان کی رذالت کا یہ عالم تھا کہ ہم جنسی میں مبتلا تھے اور کھلے بندوں اپنی مجالس میں یہ حرکات کرتے تھے۔ پھر ڈاکہ زنی اور فساد بھی ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام ان کی ان غلط کاریوں پر برابر انہیں ٹوکتے رہتے تھے۔ اس بدبخت قوم پر آنجناب کی دعوتِ رشد و ہدایت کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگ چکی تھی۔ بہت ہی کم لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت لوطؑ جب ان کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کرتے تو کبھی وہ کہتے "لوط اور اس کے ساتھیوں کو یہاں سے جلا وطن کر دو، یہ بڑے پاک صاف بنتے ہیں" اور کبھی وہ کہتے "لے آ اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے" ان کی یہ بات سن کر ہی حضرت لوط علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی۔ اس دعا کا مانگنا تھا کہ خدا کی طرف سے عذاب کا فیصلہ ہو گیا۔

فرشتے جو عذاب کا پیغام لے کر آئے وہ نوخیز خوب صورت لڑکوں کی شکل میں آئے تھے۔ ساری قوم نے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر کا گھیراؤ کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد حضرت لوط اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کو بچا کر باقی ساری قوم کو دردناک عذاب میں تباہ کر ڈالا گیا۔

اہل اصلاح اور اہل فساد کی کشمکش بہت قدیم ہے۔ بعض اوقات ہر دو گروہوں کے امتحان کے لیے اہل شر کا پلہ وقتی طور پر بھاری کر دیا جاتا ہے۔ ایسے موقع پر اہل خیر کو ڈگمگانا نہیں چاہیے بلکہ ثابت قدمی سے اپنے موقف پر ڈٹ جانا چاہیے اور مشکلات کے مقابلے پر یہ دعا کرنی چاہیئے۔

۷۸

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت، آیت: ۱۰۰)

"اے پروردگار، مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحین میں سے ہو۔"

یہ دعا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ حضرت ابراہیم کے حالات و واقعات قرآن مجید میں مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ آپ نے جب بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی تو پوری قوم آپ کی دشمن بن گئی۔ آپ کا اپنا گھرانہ بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ حق اور باطل کی کشمکش نے طول پکڑا تو بالآخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کا فیصلہ ہوا اور عملاً آپ کو آگ میں پھینک دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے آپ کو آگ سے محفوظ رکھا اور وہ آگ جس کا کام ہی جلا کر بھسم کر دینا ہے اپنے خالق کے حکم سے حضرت ابراہیم کے لیے گلزار اور امن و سلامتی کا مقام بن گئی۔

قوم کے اس طرز عمل کو دیکھ کر آپ نے ہجرت کا فیصلہ کر لیا اور اعلان کیا۔ "اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ" [1] دوسری جگہ پر آپ کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں "اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اِنَّہٗ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ" [2] جب آپ ہجرت کے لیے نکلے تو آپ کے ساتھ آپ کی بیوی حضرت سارہؑ اور آپ کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ غربت کے عالم میں آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صالح اولاد عطا کرے جو دین کے کاموں میں آپ کی معاون اور باطل کے مقابلے پر آپ کی دست و بازو ثابت ہو۔ آپ نے یہ دعا اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر دی۔ اس دعا کے ایک عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو بشارت دی کہ ایک حلیم بیٹا آپ کو عطا کیا جائے گا۔ یہ بیٹا حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے جو آپ کو ۸۶ برس کی عمر میں عطا ہوئے۔ اس کے بعد آپ کو علیم بیٹے کی خوشخبری ملی جو سو برس کی عمر میں آپ کے ہاں اسحاق علیہ السلام کی صورت میں پیدا ہوئے۔

(۷۹)

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّکَ

---

[1] الصّٰفّٰت، آیت: ۹۹ [2] العنکبوت، آیت: ۲۶

اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ (ص، آیت: ۳۵)

" اے میرے رب، مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو، بے شک تو ہی اصل داتا ہے۔"

یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا ہے۔ آپ نے خدا تعالیٰ سے پہلے تو معافی طلب کی کہ مومن ہر لحہ اللہ کے سامنے تصویر عجز و انکسار بنا مغفرت مانگتا رہتا ہے، اس کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ سے ایسی حکومت کا مطالبہ کیا جو آپ کے بعد کسی کو نہ ملے۔ مطلق حکومت تو آپ کو پہلے بھی ملی ہوئی تھی مگر آپ چاہتے تھے کہ جو احکام خداوندی آپ نے اللہ کی سرزمین پر اس کے بندوں کے درمیان جاری کر دیئے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ جنوں اور دیگر مخلوق پر بھی وہ احکام نافذ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن و انس اور پرند و چرند ہر چیز پر حکومت و اقتدار بخش دیا اور ہوا کو بھی آپ کے حکم کے تابع کر دیا کہ جدھر آپ حکم دیں اسی جانب چلے شیاطین بھی آپ کے لیے مسخر کر دیئے گئے تھے کہ وہ بدون حکم نبوی کہیں حرکت نہ کر سکتے تھے۔

بلاشبہ یہ حکومت جو سلیمان علیہ السلام کو ملی ایسی تھی کہ ان کے بعد کسی کو ایسی حکومت نہ ملی۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے انبیاء کرام ہی ہو سکتے تھے جو اس طرح کی حکومت کے لیے موزوں تھے مگر حضرت سلیمان کے بعد آنے والے انبیاء کرام نے کبھی ایسی حکومت کے لیے دعا نہیں کی کیونکہ وہ دعا حضرت سلیمان کی اس دعا کے خلاف ہوتی۔ پس پوری مخلوقات میں سے حضرت سلیمان ہی وہ شہنشاہ تھے جن کو مالکِ حقیقی نے ایسی مثالی حکومت سے نوازا تھا۔

۸۰

اِنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۝ (ص، آیت: ۴۱)

" (پروردگار) شیطان نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔ (اب تو ہی میرا سہارا ہے)"

یہ دعا حضرت ایوب علیہ السلام نے مانگی تھی۔ آپ کی ایک دعا اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے۔

یہ دعا بھی اس دعا کا حصہ ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے آزمائش میں ڈالا تھا، آپ کا پورا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا، سر سے لیکر پاؤں تک کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو ناسور نہ بن چکی ہو۔ ایسی حالت میں بھی آپ ہر لمحہ یادِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ شیطان آپ کے دل میں مختلف قسم کے وسوسے ڈالتا رہتا کہ دیکھو تم کیسی آفت کا شکار ہو چکے ہو اور کیسی شدید اذیتیں تم پر مسلط ہو گئی ہیں آخر تمہارا جرم کیا ہے؟ یہ تو صریحاً ظلم ہے کہ بے گناہ تمہیں اس عذاب میں پکڑ لیا گیا ہے۔ اس شیطانی حملہ کے جواب میں جناب ایوب علیہ السلام کا رویہ وہی تھا کہ جو بندۂ مومن کے شایانِ شان ہے یعنی شکرِ خدا کہ در مصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے۔

شیطانی حملوں کے رَدّ میں اپنی تکلیف سے نجات کے لیے حضرت ایوب علیہ السلام خدا کے حضور جھک کر یہ عرض کیا کرتے تھے کہ "مولا شیطان نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔" شیطان کے تکلیف میں ڈالنے سے یہ مراد نہیں کہ وہ عملاً کسی کو بیماری اور عذاب دینے پر قادر ہے بلکہ اس میں ایک تو یہ لطیف نکتہ ہے کہ مصیبت جو بھی آتی ہے وہ انسان کی اپنی کمائی کی وجہ سے ہوتی ہے اور شیطان اور نفس امّارہ ہی ایسے اعمال کے موجب بنتے ہیں، اس لیے شیطان کا ذکر کیا۔ دوسرے یہاں حضرت ایوب شیطانی وسوسوں کی وجہ سے شیطان کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں اور یہ وساوسِ شیطانی واقعی بڑی بلا اور عذاب ہوتے ہیں۔ جسمانی تکلیف سے زیادہ ذہنی کوفت تکلیف دہ ہوتی ہے اور شیطانی وساوس کا کام یہی ہے کہ ذہنی تکلیف میں اضافہ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی یہ دعا سُن لی، ان کے لیے زمین سے ایک چشمہ جاری کر دیا۔ اس چشمے کے پانی میں یہ خاصیت تھی کہ اسے پینے اور اس میں نہانے سے بیماریاں دور ہو جاتی تھیں۔ آپ نے اس چشمے کا پانی پیا اور غسل بھی فرمایا۔ آپ اچھے بھلے تندرست ہو گئے۔ آپ کے زمانۂ ابتلا میں تمام اعزہ و اقارب سوائے ایک بیوی کے آپ سے الگ ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پھر اہل و عیال کی کثرت سے مالامال کر دیا۔

۸۱

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ○ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ نِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

(المومن، آیت: ۷ تا ۹)

"اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ پس جن لوگوں نے توبہ کی اور تیرا راستہ اختیار کیا تو ان کو معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچا لے۔ اے ہمارے رب! ان کو ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے، اور ان کے والدین، بیویوں اور اولاد میں سے جو بھی صالح ہوں ان کو بھی ان جنات میں پہنچا دے۔ تو بلاشبہ قادرِ مطلق اور حکیم ہے۔ اور ان کو برائیوں سے بچا دے۔ جس کو تو نے قیامت کے روز برائیوں سے بچایا اس پر تو نے بڑا رحم کیا۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔"

یہ دعا اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں کی طرف سے مومنین کے حق میں خدا کے حضور مانگی جاتی ہے۔ وہ فرشتے جو اللہ جل شانہ کے عرشِ عظیم کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو ہر وقت دربارِ خداوندی میں حاضر رہتے ہیں ان کی زبان سے اہلِ ایمان کے لیے یہ دعا نکلنا کتنی بڑی سعادت ہے جب کوئی انسان یا جماعت اللہ کے راستے پر چلنے کا عزمِ صمیم کر لے اور اپنے آپ کو کلیتہً اس کام کے لیے وقف کر دے تو اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق ایسے لوگوں کے لیے دست بدعا رہتی ہے۔ دعا کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ ملائکہ مقربین کو مومنین کے ساتھ بہت گہرا قلبی تعلق ہے۔ وہ ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں جس کا لازمی

مطلب یہی ہے کہ عذاب جہنّم سے مومنین کو بچایا جائے اور دخول جنت کی سعادت بخشی جائے لیکن ازراہِ محبت فرشتے اس دعا کے بعد پھر الگ سے یہ بھی کہتے ہیں کہ یا اللہ مومنین کو دوزخ کی آگ سے بچا لیجیو اور انہیں دائمی جنّات میں داخل فرمائیو۔ اللہ اللہ! کتنی بلند شان ہے ان لوگوں کی جو اللہ کے ہو جاتے ہیں۔

دعا میں فرشتوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے کہ ان مومنین کے آبا و اجداد اور اولاد و ازداج میں سے جو بھی صلحا ہیں ان کو بھی جنت میں ان کے ساتھ شامل کیا جائے۔ یہ بھی محبّت کی ایک علامت ہے کہ مومنین کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لیے ان کے اعزہ کے حق میں یہ دعا کی جا رہی ہے۔

انسان خواہ کتنے ہی بلند مقام پر پہنچ جائے پھر بھی اس کے پھسل جانے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ فرشتے یہاں دعا کرتے ہیں کہ الٰہی ان مومنین کو سیّئات سے محفوظ رکھ۔ سیّئات میں عقائد و اعمال کی برائیاں اور دنیا و آخرت کی آفتیں اور اذیتیں سب شامل ہیں۔ گویا کہ فرشتے مومنین کے اخلاقی و روحانی تحفظ اور جسمانی آرام و راحت کی دعا کرتے ہیں۔

اے اللہ ہمیں ان لوگوں میں شامل کر جو تیرے لیے وقف ہو جاتے ہیں اور ہمیں اس دعا کا مصداق بنا دے۔ (آمین)

۸۲

إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝

(المؤمن، آیت: ۲۷)

"میں نے ہر اس متکبر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا اپنے اور تمہارے رَبّ کی پناہ لے لی ہے۔"

یہ دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ فرعون کے ساتھ جب کشمکش نے زور پکڑا تو فرعون سخت پریشان ہوا۔ بوکھلاہٹ کے عالم میں اس نے درباریوں سے کہا "مجھے چھوڑو

کہ میں موسیٰؑ کو قتل کر دوں اور یہ اپنے رب کو پکار دیکھے، مجھے خطرہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا یا زمین میں فساد برپا کر دے گا۔" فرعون کے ہاں قتل کے یہ منصوبے بن رہے تھے اور ادھر موسیٰ علیہ السلام بڑے اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنا کام کیے جا رہے تھے۔ فرعون نے موسیٰؑ علیہ السلام کے قتل کے لیے "ذَرُوْنِیْ۔ مجھے چھوڑ دو" کے الفاظ استعمال کیے ہیں حالانکہ اسے کسی نے پکڑا ہوا نہیں تھا۔ دراصل ایک تو بات یہ تھی کہ خدا نے موسیٰؑ کا رعب فرعون پر طاری کر دیا تھا اور ساری شان و شوکت کے باوجود اس میں یہ ہمت نہ تھی کہ موسیٰؑ پر ہاتھ ڈالے۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ دربار کے اندر ایسے لوگ (خواہ ان کی تعداد بہت کم تھی) موجود تھے جو اس منصوبے کے خلاف رائے دیتے تھے۔ فرعون نے قتلِ موسیٰؑ کے لیے جواز یہ پیش کیا کہ "موسیٰؑ زمین میں فساد پھیلا دے گا۔" گویا کہ تحفظ امن عامہ اور سیکورٹی ایکٹ اور ڈیفنس رولز کا سب سے پہلا استعمال فرعون نے کیا اور دنیا کے فرعون آج تک اس روش پر چلتے چلے جا رہے ہیں۔

فرعون نے مجلسِ وزراء میں جب حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے قتل کے لیے باقاعدہ قرارداد پیش کی تو اس کی اطلاع آنجنابؑ کو بھی مل گئی۔ جب آپ کو یہ اطلاع ملی تو آپؑ کا ردِ عمل کسی گھبراہٹ یا پریشانی پر محمول نہ تھا۔ آپ نے بڑے اطمینان سے فرمایا "مجھے اس کی کیا پرواہ ہے میں ہر متکبر کافر کے مقابلے پر اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں۔"

ان الفاظ میں اگرچہ باقاعدہ دعا مانگی نہیں گئی لیکن دعا کا مفہوم موجود ہے۔ مومن اللہ کی راہ میں جب بھی نکلتا ہے باطل اس کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے، کبھی تو اہلِ باطل حق کی آواز اٹھانے والوں کی شمعِ حیات گل کر دینے کا ہی تہیہ کر لیتے ہیں۔ ایسے موقع پر اہلِ حق کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اس ہستی کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کے حکم پر انہوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر ساری دنیا سے ٹکر لی ہوتی ہے، اس کی حمایت سے طاقتور کوئی حمایت اور اس کی پناہ سے محفوظ تر کوئی پناہ نہیں ہو سکتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے قتل کی خبر سنی تو فوراً اپنے آپ کو خدائے بزرگ و برتر کی مضبوط پناہ میں دے دیا۔ اس دعا کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرعون پوری کوشش اور تمام ذرائع و

وسائل کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہاتھ نہ ڈال سکا اور بالآخر خود بحرِ قلزم کی موجوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

(۸۳)

اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ م بِالْعِبَادِ ○ (المؤمن، آیت ۴۴)

" میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے "

یہ دعا مومنِ آلِ فرعون کی ہے۔ فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ پیش ہوا تو یہ مومن جس نے اسلام قبول کر لیا تھا مگر ابھی تک اس کے اسلام و ایمان کی خبر کسی کو نہ تھی بول اٹھا " اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ " یعنی کیا تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کر ڈالو گے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟ یہ الفاظ کہنے کے بعد اس مومن نے فرعون کے دربار میں ایک نہایت مبسوط، مدلل، پُر اثر اور جرأت مندانہ تقریر کی۔ یہ تقریر بلاشبہ خطاب کی بہترین مثال ہے۔ اس میں وہ دعوتِ موسوی کا مکمل تجزیہ کر کے بتاتا ہے کہ اس دعوت کے پیش کرنے والے جو بات بھی تمہارے سامنے پیش کی ہے اسے دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے اور تمہارا رویہ اس کے مقابلے پر نہایت احمقانہ ہے۔ پھر وہ حکومت اور سطوت کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ چند روزہ چمک دمک ہے اس پر اترانا کوئی عقلمندی نہیں۔ یہ تقریر سورۂ مومن پارہ ۲۴ میں آیت ۲۸ سے لے کر آیت ۴۴ تک مذکور ہے۔ تقریر کے آخر میں وہ اپنی قوم سے کہتا ہے " فَسَتَذْکُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَکُمْ " یعنی آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اسے یاد کرو گے۔"

یہ الفاظ کہنے کے بعد وہ دعا کے انداز میں تقریر ختم کرتے ہوئے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔

اس مومن کی ولولہ انگیز تقریر اور ایمان افروز دلائل نے مجلس وزراء، اور خود فرعون کو تذبذب میں ڈال دیا۔ انہوں نے سوچا کہ ہم تو موسیٰ کو ختم کر دینا چاہتے تھے مگر یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ موسیٰ کا پیغام اس ایوانِ بالا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ اب ان لوگوں کو یہ فکر لاحق ہو گئی

کہ اپنی صفوں میں دیکھیں کہاں کہاں حامیانِ موسیٰ گھسے ہوئے ہیں۔ اس صاف گو، بے باک مسلمان درباری کے خلاف نہایت گھناؤنے منصوبے بنائے گئے۔ ان منصوبوں کی تفصیلات کیا تھیں، ان کے بارے میں قرآن خاموش ہے لیکن ان کی مکروہیت کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمایا ہے "فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا" (آخر کار ان لوگوں نے جو بُری سے بُری چالیں اس مومن کے خلاف چلیں۔ اللہ نے ان سب سے اسے بچا لیا۔) گویا کہ اس بندۂ مومن کے خلاف پوری مشینری حرکت میں آگئی تھی لیکن اس نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا تھا۔ جابر بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا فریضہ ادا کر چکنے کے بعد اس کے عواقب و نتائج سے بے پروا وہ بندۂ مومن خدا سے جب یہ کہہ رہا تھا کہ "اے مولا! میں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا ہے اب میں اپنے ہر معاملہ کو تیرے حوالے کرتا ہوں۔" تو اس کے دل کی کیا کیفیت ہوگی اور رحمت خداوندی کیسے دوڑ کر اسے ڈھانپنے کے لیے بے قرار ہوگی۔

اہلِ حق کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ اپنی سعی مکمل کر کے اپنا سارا کام خدا کے سپرد کر دیتے ہیں اور پھر خدا ایسے لوگوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔

(۸۴)

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝ (الزخرف، آیت: ۱۳-۱۴)

"پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔"

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے مومنین کو سکھائی ہے کہ وہ جب بھی کبھی کسی سواری پر بیٹھیں تو یہ دعا پڑھ لیا کریں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سواری پر بیٹھتے تھے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے، پھر یہ آیت پڑھتے اور اس کے بعد یہ دعائے مسنونہ فرمایا کرتے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ فِیْ سَفَرِیْ هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى، اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ

لَنَا السَّفَرَ وَ اَطْوِ لَنَا الْبَعِيْدَ، اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَ الْخَلِيْفَةُ فِي الْاَهْلِ، اَللّٰهُمَّ اصْحَبْنَا فِي سَفَرِنَا وَ اخْلُفْنَا فِي اَهْلِنَا۔" (ماخوذ از تفہیم القرآن جلد چہارم بروایت حضرت عبداللہ ابن عمرؓ۔ مسند احمد۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ دارمی۔ ترمذی) ترجمہ:۔" خدایا میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے اس سفر میں مجھے نیکی، تقویٰ اور ایسے عمل کی توفیق دے جس سے تو راضی ہو۔ خدایا ہمارے لیے سفر کو آسان بنا دے اور لمبی مسافت کو لپیٹ دے، خدایا تو ہی سفر کا ساتھی اور ہمارے پیچھے ہمارے اہل و عیال کا نگہبان ہے، خدایا ہمارے سفر میں ہمارے ساتھ رہ اور ہمارے پیچھے ہمارے گھر والوں کی خبر گیری فرما۔"

اس دعا کی تفسیر کرتے ہوئے مرشد مودودی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک روایت احمد، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ" ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کہہ کر رکاب میں پاؤں رکھا، پھر سوار ہونے کے بعد فرمایا الحمد للہ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا...... پھر تین مرتبہ الحمد للہ اور تین دفعہ اللہ اکبر کہا، پھر فرمایا سبحانک لا اله الا انت، قَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ۔ اس کے بعد آپ ہنس دیئے۔ میں نے پوچھا یارسول اللہ آپ ہنسے کس بات پر؟ فرمایا، بندہ جب رب اغفرلی کہتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ کو اس کی بات بڑی پسند آتی ہے، وہ فرماتا ہے کہ میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا مغفرت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

یہ دعا ہر سواری پر چڑھتے وقت مانگی جاتی ہے۔ اس دعا کے ساتھ انسان کے ذہن میں فوراً یہ احساس پیدا ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے نہایت طاقتور جانوروں اور بے حد قوی مظاہرِ قدرت کو اس کمزور سی مخلوق کے لیے مسخر کر دیا ہے تو اس ذات کا شکر اور اس کی اطاعت مجھ پر لازم ہے۔ دعا کے آخر میں اپنے رب کی طرف پلٹنے کی یاد تازہ کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس سفر کے بعد ایک اصلی سفر اور آخری کوچ بھی مقدر ہے اور اس کا وقت بھی لازماً آنا ہے۔ نیز سفر کے دوران حادثات کا امکان موجود ہوتا ہے اور یہ سفر انسان کا آخری سفر ثابت ہو سکتا ہے لہٰذا انسان کو اپنے خالق کے دربار میں حاضری کا احساس تازہ کر لینا چاہیئے۔

(۸۵)

اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝ (الدّخان آیت: ۲۰)

"میں تمہارے حملوں کے مقابلے پر اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں۔"

یہ بھی حضرت موسٰی علیہ السلام کی دعا ہے۔ اس سے پہلے سورہ مومن کی دعا گزر چکی ہے۔ فرعون اور اس کے حواریوں نے جب حضرت موسٰی علیہ السلام پر حملہ کر کے انہیں شہید کر ڈالنے کا پروگرام بنایا تو آپ نے ان کے جواب میں یہ بات فرمائی۔ اس کے بعد پھر آپ نے اللہ کے دربار میں یہ رپورٹ پیش کی کہ "اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ[1]" اس کے جواب میں اللہ کے دربار سے فرعون اور اس کی قوم کے لیے فیصلہ کر دیا گیا اور چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ لقمۂ اجل بن گئے۔

(۸۶)

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (الاحقاف آیت: ۱۵)

"اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا کی ہیں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو، اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان بندوں میں سے ہوں۔"

یہ دعا مومن صالح کی طرف سے اللہ کے دربار میں کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں انسان کو پیدا کرتا ہوں، پھر وہ کمزور و ناتواں بچے کی صورت میں ماں کے دودھ پر پرورش پاتا

---

[1] (اے مولا) یہ قوم جرم میں بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ (دخان، آیت: ۲۲)

رہتا ہے اس کے بعد وہ زندگی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اپنے عروج کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر انسان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں، ایک گروہ تو ماں باپ کے حقوق پامال کرتا ہے اور اللہ کے احکام کا انکار کرتا ہے مگر ایک گروہ اس کے برعکس حقوق الدین کے معاملے میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے اور اللہ کے سامنے مطیع فرمان بن کر حاضر ہوتا ہے۔ یہ دوسرا گروہ اپنی فرماں برداری کے ساتھ اللہ کے حضور مندرجہ بالا دعا پیش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس مومن گروہ سے ہم ان کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ان سے یہ سچا وعدہ ہے۔ یہ دعا حضرت سلیمان علیہ السلام کی سورۂ نمل والی دعا سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فرماں بردار بندوں میں شامل کرے۔

(۸۷)

اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝ (القمر، آیت: ۱۰)

"(اے میرے پروردگار) میں مغلوب ہو چکا، اب تو ان سے انتقام لے"

یہ دعا حضرت نوح علیہ السلام کی ہے۔ ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو راہ حق کی طرف دعوت دی مگر قوم نے چند لوگوں کے سوا، مان کر نہ دیا۔ قوم نے نہ صرف انکار کیا بلکہ آنجناب کو بہت بری طرح سے دھمکیاں دیں۔ برا بھلا کہا اور جھڑکا "فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ" (القمر) انہوں نے ہمارے بندے کو جھوٹا قرار دیا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے، اور وہ (نوحؑ) بری طرح جھڑکا گیا۔

ایک طویل عرصے تک نہایت استقلال اور عالی ظرفی کے ساتھ آپ نے فریضۂ تبلیغ سرانجام دیا لیکن جب قوم کے بارے میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے تو آپ نے ان کے لیے یہ بددعا فرمائی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اس قوم سے انتقام لیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے ایسا انتقام لیا کہ قیامت تک مثال بن گیا۔ ساری قوم طوفانِ بلاخیز میں ڈوب کر دنیا سے

نابود ہوگئی، حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے مومن رفقا اس عذاب سے بچا لیے گئے۔ (واقعات پہلے گزر چکے ہیں۔)

(۸۸)

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ○

(الحشر، آیت: ۱۰)

"اے ہمارے پروردگار، ہمیں اور ہمارے پیش رو اہل ایمان بھائیوں کو بخش دے، اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب، تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔"

اس آیت سے پہلے کی آیات میں مسائل فے بیان کیے گئے ہیں۔ ان مسائل کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے مستحقین کی ایک فہرست بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ان کے علاوہ مہاجرین، انصار اور انصار و مہاجرین کے بعد آنے والے مومنین کا بھی فے میں حصہ ہے۔

مہاجرین کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ میرے محبوب بندے ہیں کہ "جن کو ان کے گھروں اور جائدادوں سے نکال دیا گیا۔ یہ لوگ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے طلبگار ہیں، اور ہر وقت اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں، یہی راستباز لوگ ہیں۔"

پھر انصار کی صفات عالیہ کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ وہ لوگ ہیں جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ایمان لاکر دارالھجرت میں مقیم تھے۔ یہ مہاجرین سے گہری محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ بھی دے دیا جائے، اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر اپنے دوسرے بھائیوں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہیں۔

تیسرے نمبر پر مہاجرین و انصار کے بعد آنے والے مسلمانوں کا ذکر کرکے ان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے سابقون الاولون کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے

مغفرت طلب کرتے رہتے ہیں اور ان کی خدا تعالیٰ سے یہ درخواست ہوتی ہے کہ وہ ان کے دل میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ پیدا کرے۔ اس دعا کے داعی خصوصاً تابعین کرام اور عموماً قیامت تک آنیوالے اہل ایمان ہیں۔

یہ نہایت اہم دعا ہے۔ ایمان کا رشتہ جس طرح نسلی، علاقائی، لسانی اور الوانی حد بندیوں سے بلند و بالا ہے اسی طرح زمان و مکان کی قیود بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اہل ایمان جب بھی اور جہاں بھی گزرے ہوں، مومن کے لیے ان سے محبت لازمۂ ایمان ہے یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جس کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح تلی ہوئی ہیں کہ یک جان دو قالب کی صحیح مثال ہیں۔ آج ہم تک اسلام پہنچا ہے تو ان لوگوں کی وجہ سے پہنچا ہے جن کے ذریعے خدا نے اس دین کو نسلاً بعد نسلاً محفوظ رکھا ہے۔ انہی لوگوں کی برکات سے ہم نے اسلام کی روشنی پائی۔ پس ان کے اس احسان کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہا کریں۔ ہمارا جسمانی رشتہ تو ان سے منقطع ہوگیا ہے مگر روحانی تعلق کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ہم جب بھی خلوص نیت کے ساتھ دعاؤں کے تحفے ان کی خدمت میں بھیجیں گے یہ ان کو ملیں گے۔

اہل ایمان خواہ وہ زندہ ہوں یا دنیا سے گزر چکے ہوں کسی بندۂ مومن کی یہ شان نہیں ہو سکتی کہ ان کے بارے میں اس کے دل میں بغض ہو۔ چونکہ انسان کا نفس اور شیطانی طاقتیں ہر وقت کمربستہ رہتی ہیں کہ اہل ایمان کے دلوں میں باہمی بغض و عداوت پیدا کی جائے اس لیے مومنین کو ہر وقت یہ دعا کرتے رہنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل میں اہل ایمان کے لیے جذباتِ خیر پیدا کرے اور جذباتِ شر سے اسے محفوظ رکھے۔

(۸۹)

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ إِنَّكَ أَنتَ

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۞ (الممتحنہ، آیت: ۴-۵)

"اے ہمارے پروردگار، ہم نے تجھ پر ہی بھروسا کیا اور تیری طرف ہی رجوع کیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے۔ اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے۔ اور اے ہمارے رب، ہمارے قصوروں سے درگزر فرما، بیشک تو زبردست اور دانا ہے۔"

یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کی ہے۔ بت پرست قوم کے ساتھ ان کی نبھ نہ سکی اور انہوں نے اس علاقے اور قوم کو خیر باد کہہ کر خدا کی راہ میں ہجرت اختیار کر لی۔ جاتے ہوئے انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ہمارے تمہارے درمیان کھلی جنگ ہے۔ ہمارا راستہ الگ اور تمہارا راستہ الگ ہے۔ ہمارے تمہارے درمیان مصالحت کی کوئی صورت ممکن نہیں سوائے اس کے کہ تم اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لا کر ہماری ملت میں شامل ہو جاؤ۔ قوم سے یہ بات کہنے کے بعد یہ اہل اللہ بارگاہِ صمدانی میں ہاتھ اٹھا کر عرض کرتے ہیں کہ "مولائے کریم ہم نے پوری دنیا سے منہ موڑ لیا ہے، ہر طاقت کو چیلنج دے دیا ہے اور ہر باطل پرست کی حمایت سے بیزاری کا اعلان کر دیا ہے۔ اب ہمارا بھروسہ تیری ہی ذات ہے اور ہماری نگاہیں اب تجھی پر لگی ہوئی ہیں۔ ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا اور تو ہماری مغفرت فرما۔"

"کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا" کا مفہوم سورۂ یونس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی دعا میں واضح کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو کافروں کو ہم پر مسلط نہ کر کہ وہ اس تسلط کو اپنے حق پر ہونے کے لیے دلیل بنا لیں اور نہ ہی ان کو ہم پر ظلم و ستم کی کھلی چھٹی دے دے کہ ہماری قوت برداشت جواب دے جائے اور ہم دب کر کوئی سودے بازی کر لیں۔ نیز ہمارے اخلاقی و روحانی کردار کو نقائص سے پاک رکھ ورنہ کافر ہماری کمزوریوں کو دیکھ کر کہیں گے کہ آخر یہ کیسے اہل حق ہیں جن کے کردار میں وہی کچھ پایا جاتا ہے جو دوسرے لوگوں میں موجود ہے۔

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ التحریم ۸

" اے ہمارے رب، ہمارا نور ہمارے لیے مکمل فرما دے اور ہمارے گناہ معاف کر دے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

یہ مومنین کی دعا ہے جو وہ قیامت کے روز اللہ کے دربار میں پیش کریں گے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے مومنو تم مخلصانہ شان کے ساتھ توبہ کرو، قریب ہے، کہ خدا تمہارے گناہ معاف فرما دے اور تمہیں اس دن جنات میں داخل کر دے جس دن وہ اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے اُمتیوں کو عزت بخشے گا۔ ان کو ایک روشنی دی جائے گی جو ان کے آگے اور ان کے دائیں جانب چمکتی ہوئی پھیل جائے گی۔ پھر وہ اس روشنی کو دیکھ کر مندرجہ بالا دعا کریں گے۔

قیامت کے ہولناک مناظر میں سے ایک ظلمات قیامت (قیامت کی تاریکیاں) بھی بیان ہوا ہے۔ اس تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے گا۔ ایسے عالم میں اللہ اپنے فضل خاص سے اہل ایمان کے لیے نور کا اہتمام کر دے گا۔ مومنین کو جب یہ نور ملے گا تو وہ اللہ سے درخواست کریں گے " مولا یہ نور ہمیں ہمیشہ کے لیے دے دے اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرما۔"

علامہ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں محمد بن نصر مروزی کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ حدیث کی روایت دو جلیل القدر صحابی حضرت ابو الدردا اور حضرت ابو ذر غفاری نے بیان کی ہے وہ کہتے ہیں " حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب سے پہلے مجھے سجدہ ریز ہونے کی اجازت ملے گی اور مجھی کو سب سے پہلے سجدے سے سر اٹھانے کا اذن ہوگا پھر میں تمام مجمع امم میں سے اپنی اُمت کو پہچان لوں گا۔ ایک شخص نے سوال کیا۔ " یا رسول اللہ! آپ تمام امتوں کے درمیان اپنی امت کو کیوں کر پہچان لیں گے؟ فرمایا میری اُمت کے لوگوں کے چہرے طہارت کی وجہ سے چمک رہے ہوں گے اور یہ امتیازی شان سوائے میری امت کے کسی کو نہ ملے گی دوسرے میری اُمت کے

لوگوں کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ تیسرے میں ان کے چہروں پر آثار سجود ان کا نور ان کے سامنے دوڑ رہا ہوگا۔ "اعرفھم منودھم یَسْعٰی بین ایدیھم"
سورۃ الحدید میں بھی آیت ۱۲ سے بیکر ۱۵ تک مومنین کے اس نور کا تذکرہ کیا گیا ہے۔
اس دن مومنین کے اس نور کو دیکھ کر منافقین بھی کہیں گے کہ ٹھہرو ہم بھی تمہارے نور میں اپنا سفر طے کر لیں مگر ان کو یہ نور ہرگز فائدہ نہ دے گا کیونکہ یہ نور تو اعمال صالحہ اور خلوص و وفاداری کا پرتو ہوگا اور منافقین کے ہاں یہ جنس مفقود ہے۔
حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اس نور کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ مومنین کو ان کے اعمال کے بقدر عطا ہوگا۔ جس کے جتنے بلند اعمال ہوں گے اس کو اتنا ہی قوی نور ملے گا۔ اسی طرح حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومنین میں سے کسی کا نور اتنا عظیم ہوگا کہ مدینہ سے عدن تک کی مسافت میں ہر چیز اسے نظر آئے گی اور کسی کا نور اتنا ہوگا کہ دو قدم تک ہی پھیل سکے گا۔ اس مضمون کی احادیث بہت کثیر تعداد میں مذکور ہوئی ہیں۔
اللہ تعالیٰ ہمیں اس دن اپنے فضلِ خاص سے نور کی دولت سے نوازے۔ (آمین)

(۹۱)

رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ التحریم ۱۱

"اے میرے رب، میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا لے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے۔"

یہ دعا فرعون کی بیوی نے مانگی تھی۔ خدا کی کیا شان ہے کہ نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویاں پیغمبروں کے گھر میں ہونے کے باوجود ایمان سے محروم رہ جاتی ہیں اور یہ خوش بخت خاتون فرعون جیسے دشمن خدا کے نکاح میں ہونے کے باوجود رشد و ہدایت کے بلند مقام پر فائز ہو جاتی ہے۔
اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ کوئی اندھی بانٹ نہیں ہے بلکہ یہ نازک ترین معاملہ غور و فکر کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور کی دولت بخشی اور نیکی و بدی کی تمیز کا جوہر اس کے دل و دماغ میں ودیعت کر دیا "فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا" (الشمس) پھر انبیائے کرام کے ذریعے واضح ہدایات انسان کے سامنے پیش کر کے اتمام حجت کر دی۔ اب انسان کو یہ سہولتیں دینے کے بعد اس کے سامنے یہ بھی وضاحت کر دی گئی کہ اگر وہ چاہے تو راہِ ہدایت پر قدم بڑھا دے اور اگر چاہے تو ضلالت کا راستہ اختیار کر لے۔ جو نیک نیتی کے ساتھ اور اگر چاہے تو ضلالت کا راستہ اختیار کر لے۔ جو نیک نیتی کے ساتھ حقیقت کو پا لینے کی کوشش کرے گا وہ ضرور کامیاب ہو گا۔ فرمایا "اللّٰهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ" (شوریٰ)

مومنِ آلِ فرعون کی دعا اس سے پہلے گزر چکی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت حکمران قوم کے اونچے محلات میں پہنچ کر خوب مضبوطی سے جڑ پکڑ چکی تھی اور جن لوگوں نے اس پیغام پر لبیک کہی وہ اپنی کشتیاں جلا کر آئے تھے، واپس لوٹ جانے کا کوئی خیال ان کے ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھا۔ فرعون کی بیوی نے جب اسلام قبول کیا تو دربار میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ فرعون کی ناکامی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی تھی، کہ اس کی رفیقۂ حیات اس کے دین کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی۔ اس نے اس مومن خاتون کو آزمائش کی سخت بھٹی میں ڈال دیا۔

علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ابن جریر کے حوالے میں لکھتے ہیں "فرعون کی بیوی کو دھوپ میں باندھ کر عذاب دیا جاتا تھا اور جوں ہی انہیں دھوپ میں کھڑا کر کے لوگ الگ ہوئے، ملائکہ اس خاتون پر سایہ کر لیتے اور وہ اپنا گھر جنت میں بنا بنایا، سجا سجایا دیکھ لیتی۔" ابن جریر ہی کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں۔ "فرعون کی بیوی پوچھا کرتی تھی "مَنْ غَلَبَ؟" یعنی کون غالب آیا (شاید یہ جادوگروں کے حضرت موسیٰ سے مقابلے کے موقع پر کہا گیا ہو گا) تو جواب ملا کہ موسیٰ اور ہارون کا رب۔ اس پر وہ پکار اٹھیں "میں موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئی ہوں۔" فرعون کو پتہ چلا تو حکم دیا کہ اسے سب سے بڑی چٹان کے نیچے جا کر کھڑا کر دو اور اس سے پوچھو کہ وہ کس پر ایمان رکھتی ہے اگر وہ "صحیح" جواب دے تو چھوڑ دو ورنہ وہ چٹان اس پر گرا دو۔ جب یہ سارا ڈرامہ کھیلا گیا تو اس پاک سیرت خاتون نے اپنے ایمان کا

اعلان کیا اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں جنت میں انہیں اپنا گھر نظر آیا۔ چٹان ان کے اوپر گرا دی گئی مگر وہ چٹان گرنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۶۳-۶۴)

ابو جعفر رازی کے حوالے سے حافظ ابن الاثیر لکھتے ہیں کہ فرعون کی بیوی سے پہلے فرعون کے وزیر خزانہ کی بیوی نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس خاتون کو بڑے دکھ دے دے کر شہید کیا گیا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں زمین پر پھیلا کر اوپر سے لمبی لمبی میخیں گاڑ دی گئیں، اس کے اوپر سانپ چھوڑے گئے، اس کے دونوں بیٹوں کو ذبح کر کے ان کا خون اس کے منہ میں ڈالا گیا لیکن وہ اللہ کی بندی ثابت قدم رہی اور ایمان کی حالت میں جام شہادت نوش کر کے دنیا سے رخصت ہوئی۔ اسی کے کردار سے متاثر ہو کر زوجۂ فرعون نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کو بھی اسی طرح عذاب دیا گیا اور یہ مسکراتی رہیں اور مندرجہ بالا دعا کا ورد کرتی رہیں تاکہ ان کے مقدر میں بھی شہادت کا مقام لکھ دیا گیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

قرآن مجید میں فرعون کو "ذِی الْاَوْتَادِ" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے (سورہ الفجر) غالباً یہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ اہل ایمان کے ہاتھ پاؤں زمین پر بچھا کر میخیں گڑوا دیا کرتا تھا[1]۔ لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَعَلٰی سَائِرِ الْکَفَرَۃِ۔ فرعون کی بیوی کا نام آسیہ بنت مزاحم بیان کیا گیا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ حضرت آسیہ نے اپنی دعا میں گھر سے پہلے اپنے ہمسایے کا تعین اور مطالبہ کیا۔ "اِخْتَارَتِ الْجَارَ قَبْلَ الدَّارِ" یعنی "اے اللہ اپنے پاس میرا گھر جنت میں بنا دے۔" اس میں اللہ کو اپنا ہمسایہ بتایا گیا ہے اور اس سے اچھا ہمسایہ کون ہو سکتا ہے؟

حضرت آسیہ بہت بلند مرتبت خاتون تھیں کہ قرآن مجید نے ان کو اہل ایمان کے لیے حضرت مریم کے ساتھ بطور مثال پیش کیا ہے۔ حدیث میں بھی ان کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر چار لکیریں کھینچیں اور پوچھا۔ "اَتَدْرُوْنَ مَا ھٰذَا؟" (جانتے ہو

---

[1] اوتاد جمع ہے وتد کی اور وتد کے معنی ہیں میخ۔ ذوالاوتاد کا مطلب ہے میخوں والا شخص۔

یہ کیا ہے ؟) صحابہؓ نے عرض کیا "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں"۔ آپ نے فرمایا جنتی خواتین میں سے چار سب سے افضل ہیں۔ خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمدؐ، مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم زوجۂ فرعون۔"

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری کے حوالے سے روایت لکھی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ " مردوں میں سے تو بہت سے درجۂ کمال تک پہنچے مگر عورتوں میں سے آسیہ بنت مزاحم، مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد ہی اس مقام پر فائز ہوئیں اور عائشہ کی فضیلت باقی خواتین کے مقابلے پر ایسی ہے جیسے ثرید کی باقی تمام کھانوں پر۔"

⑨②

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝

" میرے رب ان کافروں میں سے کسی کا نام و نشان باقی نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور پرلے درجے کا کافر ہی ہوگا۔"

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے بدکار و بدبخت قوم کے لیے بددعا کی گئی ہے اس دعا میں ہی یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ کیوں اللہ کے پیغمبر نے اتنی انتہائی کارروائی کا مطالبہ اللہ تعالیٰ سے کیا۔ دراصل تقریباً ایک ہزار سال کی مسلسل اور ان تھک محنت، رات اور دن کی پیہم تبلیغ اور بے لوث و پرخلوص وعظ و نصیحت کے بعد حضرت نوح کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اب اس قوم میں خیر اور اصلاح کے لیے کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ یہ قوم اگر کچھ عرصہ مزید دنیا میں موجود رہی تو برائی کے بیج تو خوب پھیلا دے گی لیکن اس سے کوئی صاحب ایمان جنم نہیں لے گا۔ ان میں سے اگر کوئی بھی باقی بچ گیا تو گویا برائی کی جڑ نہ کٹے گی صرف اس کے تنے پر ہی ضرب لگے گی لہٰذا برائی کے کلیتہً خاتمے کے لیے لازمی ہے کہ اس شریر قوم کو صفحہ ہستی

سے ناپید کر دیا جائے۔

آنجنابؑ کی اس دعا کا نتیجہ ہی تھا کہ وہ قوم کافرین الیسی ختم ہوئی کہ کوئی متنفس اس میں سے نہ بچا۔ آئندہ نسل انسانی حضرت نوحؑ اور ان کے مومن صحابہ کی اولاد سے ہی پھیلی۔ (تفصیلات پہلے آنے والی ادعیۂ نوح میں آ چکی ہیں)۔

(۹۳)

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۧ (الاخلاص آیات: ۱ - ۴)

"کہو، وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔"

یہ سورۂ اخلاص ہے۔ اس کی بڑی فضیلت احادیث کے اندر آئی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن مجید کی یہ مختصر سی سورہ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ یہ حدیث مختلف انداز اور مختلف طرق سے حدیث کی تمام کتب میں منقول ہے۔ علمائے اس کے ⅓ قرآن ہونے کی توجیہہ یہ پیش کی ہے کہ قرآن مجید میں (۱) توحید (۲) رسالت اور (۳) آخرت تین چیزوں کو عقیدہ کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ سارا قرآن انہی تین بنیادی تصورات کی مزید تشریح کرتا ہے۔ چونکہ ان تین نکات میں سے ایک یعنی توحید بکمال و تمام اس سورہ میں بیان کر دی گئی ہے اس لیے اسے ایک تہائی قرآن کہا گیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سورہ کو دعاؤں میں پڑھا کرتے تھے۔ اسی لیے میں نے اس کو دعاؤں میں شامل کیا ہے۔

حدیث شریف میں (بخاری و مسلم بروایت حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ) روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو کسی مہم پر امیر بنا کر روانہ کیا۔ دوران سفر وہ ہر نماز کی امامت میں قرأت سورۂ اخلاص پر ختم کرتے تھے۔ واپسی پر باقی صحابہؓ نے حضور سے یہ واقعہ عرض

کیا۔ آپ نے ان صحابی سے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ "اس سورہ میں رحمان کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اس لیے اس کا پڑھنا مجھے بہت محبوب ہے۔" آنحضور نے فرمایا۔ "اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُحِبُّہٗ۔"

بے شک اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت کرتا ہے۔

اور بھی بہت سی روایات فضیلت سورۂ اخلاص کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں۔

انسان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور اس سورہ میں اللہ کی صفات کا مختصر مگر نہایت جامع تذکرہ ہے اس لیے دعاؤں کے ساتھ اس سورہ کا پڑھا جانا قبولیت دعا کے لیے نہایت بہترین ممد ہوتا ہے۔

(۹۴)

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ (الفلق، آیات: ۱-۵)

"کہو، میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی، ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے۔ اور رات کی تاریکی کے شر سے جبکہ وہ چھا جائے اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے۔ اور حاسد کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے۔"

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

(الناس، آیت: ۱-۶)

"کہو، میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے معبود حقیقی کی اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔"

ان دونوں سورتوں کو معوذتین کہا جاتا ہے۔ ان کے اندر تمام قسم کے شرور سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہر دشمن کے شر سے بچنے کے لیے یہ تحفہ دیا تھا۔ احادیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سونے سے قبل سورۂ کافرون، سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھا کرتے تھے اور صحابہؓ کو بھی اس کی تلقین کیا کرتے تھے۔

روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیماری کی حالت میں اور عام حالات میں بھی معوذات (معوذتین اور سورۂ اخلاص) تین مرتبہ پڑھ کر ہاتھوں پر پھونکتے اور پھر اپنے سر سے لے کر پاؤں تک سارے جسم پر ہاتھ پھیرتے۔ آخری بیماری میں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ کمزور ہو گئے تو حضرت عائشہ نے یہ سورتیں پڑھ کر آپ ہی کے دستانِ مبارک پر پھونک ماری اور پھر آپ کا اپنا ہاتھ ہی اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر سارے جسم پر پھیرا۔ یہودانِ مدینہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب جادو کیا تو اس کے بعد یہ اللہ کی جانب سے آپ کی حفاظت کے لیے تحفہ کے طور پر نازل ہوئیں۔ تفصیلات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن میں یا علامہ ابن کثیرؒ کی تفسیریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین